الرسالہ

Al-Risala

September 1996 • Issue 238 • Rs. 7

تمام کامیابیوں کا راز یہ ہے کہ آدمی اپنے آپ کو
دوسرے درجہ میں رکھنے پر راضی ہو جائے۔

The Islamic Centre Publications

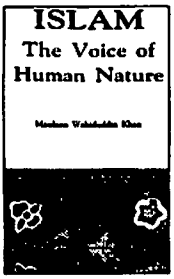

ISLAM: THE VOICE OF HUMAN NATURE
22×14.5cm, 64 pages
ISBN 81-85063-74-5
Rs. 30

MUHAMMAD: THE PROPHET OF REVOLUTION
22×14.5cm, 228 pages
ISBN 81-85063-00-1
Rs. 85

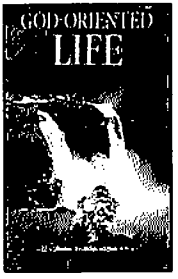

GOD-ORIENTED LIFE
22×14.5cm, 186 pages
ISBN 81-85063-97-4
Rs. 70

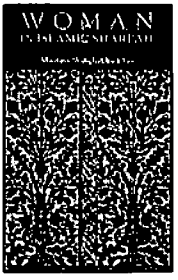

WOMAN IN ISLAMIC SHARI'AH
22×14.5cm, 150 pages
Rs. 65 (Paperback)
Rs. 185 (Hardbound)

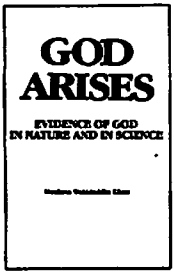

GOD ARISES
22×14.5cm, 271 pages
ISBN 81-85063-14-1
Rs. 85

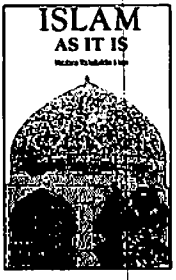

ISLAM AS IT IS
22×14.5cm, 114 pages
ISBN 81-85063-95-8
Rs. 55

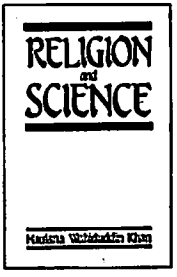

RELIGION AND SCIENCE
22×14.5cm, 96 pages
Rs. 45

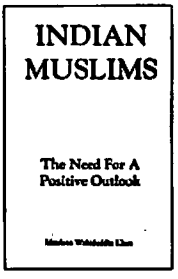

INDIAN MUSLIMS
22×14.5cm, 192 pages
Rs. 65 (Paperback)
Rs. 175 (Hardbound)

'INTRODUCTION TO ISLAM' SERIES

In this 'Introduction to Islam' series Maulana Wahiduddin Khan—a famous Islamic thinker and scholar and President of the Islamic Centre, New Delhi—has presented the fundamental teachings of Islam in a simple way. The complete series is as follows:

1. The Way to Find God (20 pages; Rs. 12)
2. The Teachings of Islam (46 pages; Rs. 15)
3. The Good Life (36 pages; Rs. 12)
4. The Garden of Paradise (36 pages; Rs. 15)
5. The Fire of Hell (44 pages; Rs. 15)

The series provides the general public with an accurate and comprehensive picture of Islam—the true religion of submission to God. In the first pamphlet it is shown that the true path is the path that God has revealed to man through His prophets. The second pamphlet provides an introduction to various aspects of the Islamic life under forty-five separate headings. Qur'anic teachings have been summarized in the third pamphlet in words taken from the Qur'an itself. In the fourth pamphlet the life that makes man worthy of paradise has been described and in the last pamphlet the life that will condemn him to hell-fire.

AL-RISALA BOOK CENTRE
1, Nizamuddin West Market, New Delhi 110 013 Tel. 4611128 Fax: 11-4697333

بسم اللہ الرحمن الرحیم

الرسالہ

زیر سرپرستی
مولانا وحید الدین خان
صدر اسلامی مرکز

اردو، ہندی اور انگریزی میں شائع ہونے والا اسلامی مرکز کا ترجمان

ستمبر ۱۹۹۶، شمارہ ۲۳۷

فہرست	صفحہ	فہرست	صفحہ
ایک آیت	۴	دین میں آسانی	۱۴
اسلام کی شناخت	۵	خودکشی کی چھلانگ	۱۶
زیادہ ثواب	۶	پوپ کے جواب میں	۱۷
ایمان وعمل	۸	دو ہجرتیں	۲۲
دلیل نبوت	۱۰	تحمل کی ضرورت	۲۷
جنگ کا قانون	۱۱	سفرنامہ برطانیہ ۔۳	۳۲
عوام وخواص	۱۲	خبرنامہ اسلامی مرکز۔۱۴۴	۴۷

AL-RISALA (Urdu)
1, Nizamuddin West Market, New Delhi-110013, Tel. 4611128, 4611131 Fax: 91-11-4697333
Single copy Rs. 7, Annual subscription Rs. 70, Abroad: $ 20 (Air mail), $ 10 (Surface mail)
Printed and published by Saniyasnain Khan at Nice Printing Press, Delhi
Distributed in UK and USA by:
IPCI: ISLAMIC VISION
481, Coventry Road, Birmingham B10 0JS
Tel. 0121-773 7117, Fax: 0121-773 7771
MAKTABA AL-RISALA
1439 Ocean Ave., 4C Brooklyn
New York NY 11230 Tel. 718-2583435

ایک آیت

قرآن (المائدہ ۴۴) میں ہے کہ اور جو کوئی اس کے موافق فیصلہ نہ کرے جو اللہ نے اتارا ہے تو وہی لوگ کافر ہیں (ومن لم یحکم بما انزل اللہ فاولئک ھم الکافرون)

ان الفاظ سے بظاہر ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ما انزل اللہ کے مطابق فیصلہ نہ کرنے سے آدمی کافر ہو جاتا ہے۔ اسی طرح بہت سی حدیثیں ہیں جن میں بعض اعمال پر کفر کی خبر دی گئی ہے۔ مثلاً رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: سباب المسلم فسوق وقتالہ کفر (مسلم کو گالی دینا فسق ہے اور اس سے جنگ کرنا کفر ہے) البخاری، کتاب الایمان

اس طرح کی آیتوں اور حدیثوں کو لے کر کچھ اسلام پسند حضرات ان مسلمانوں کو کافر قرار دیتے ہیں جو ان کے نزدیک ما انزل اللہ پر فیصلہ نہیں کر رہے ہیں۔ اسی نظریہ کے تحت وہ بہت سے مسلم حکمرانوں کو مرتد اور کافر بتاتے ہیں اور ان کے قتل کو جائز قرار دے رہے ہیں۔ اس قسم کا نظریہ بدترین گمراہی ہے اور اس نے عالم اسلام میں خارجیت جیسے ایک فتنہ کو دوبارہ شدید تر صورت میں زندہ کر دیا ہے۔ اس کے نتیجہ میں نہ صرف مسلمان مسلمان کو قتل کر رہے ہیں، بلکہ خود اسلام کی تصویر ایک ایسے مذہب کی ہو گئی ہے جو تشدد اور خوں ریزی کی تعلیم دیتا ہو۔

اس قسم کی آیات و احادیث کی صحیح تفسیر وہ ہے جو حبر الامت اور امام التفسیر عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہ نے کی۔ انھوں نے کہا کہ اس سے مراد وہ کفر نہیں ہے جس سے آدمی خارج از اسلام قرار پاتا ہے۔ بلکہ اس سے مراد کفر دون کفر ہے۔ یعنی کفر سے کمتر درجہ کا ایک کفر (الترمذی، کتاب الایمان)

قرآن و حدیث میں جہاں اس قسم کے الفاظ استعمال ہوئے ہیں وہ فقہی یا قانونی مفہوم میں نہیں ہیں۔ وہ ایک اسلوب کلام ہے۔ وہ دراصل زجر میں مبالغہ ہے۔ یہ شدت کلام کی ایک مثال ہے۔ اور ناصحانہ کلام میں ہمیشہ اس قسم کا انداز اختیار کیا جاتا ہے، کبھی ایک قسم کے الفاظ میں اور کبھی دوسری قسم کے الفاظ میں۔ یہ قانونی زبان اور ناصحانہ زبان کا فرق ہے نہ کہ فقہی معنوں میں مسلم اور کافر کا فرق۔

نصیحت اور تنبیہ کبھی سادہ الفاظ میں کی جاتی ہے اور کبھی شدید الفاظ میں۔ مذکورہ مثالیں اسی نوعیت کی شدید انداز کی مثالیں ہیں۔

اسلام کی شناخت

اسلام کی شناخت ملی نہیں ہے بلکہ ربانی ہے۔ مسلم کی پہچان یہ نہیں ہے کہ اس کا کلچر الگ ہو۔ مسلم کی حقیقی پہچان یہ ہے کہ اس کی شخصیت عام انسانوں سے مختلف ہو۔ دور اول کے عرب میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی پہچان یہ نہیں تھی کہ آپ کی زبان، آپ کا لباس، آپ کا رہن سہن دوسروں سے مختلف تھا۔ آپ کی پہچان یہ تھی کہ آپ الامین ہیں۔ بہت سے خداؤں کے دیس میں آپ ایک خدا کی عبادت کرنے والے ہیں۔

حدیث میں ہے کہ: خِيَارُكُمُ الَّذِينَ إِذَا رُؤُوا ذُكِرَ اللّٰهُ (ابن ماجہ، کتاب الزہد) یعنی تم میں بہتر وہ لوگ ہیں کہ جب انھیں دیکھا جائے تو خدا یاد آئے۔

اسلامی شناخت کا صحیح تصور یہی ہے۔ سچا مومن وہ ہے جس کو دیکھنا اور جس سے ملنا آدمی کے لیے ایک ربانی تجربہ بن جائے۔ جس کا کلام خدا کی عظمت کا اعلان بنا ہوا ہو۔ جس کے سلوک میں جنتی انسان کی خوشبو بسی ہوئی ہو۔ جس کا بولنا اس کے سننے والوں کو چپ کر دیتا ہو۔ اور جس کی خاموشی میں لوگوں کو تقریر کی کیفیت محسوس ہونے لگے۔

مومن وہ انسان ہے جس کو خدا کی معرفت حاصل ہو گئی ہو۔ جس کا سینہ خدا کی یاد سے پھٹ پڑا ہو۔ جو دیکھنے سے پہلے خدا کو دیکھنے لگا ہو۔ ایسا انسان اپنے پورے وجود کے ساتھ خدا کی ایک نشانی بن جاتا ہے۔ اس کی پوری شخصیت ایک آسمانی نور میں نہائی ہوئی ہوتی ہے۔ ایسا آدمی اپنے لباس سے نہیں پہچانا جاتا۔ وہ اپنی اس اندرونی شخصیت سے پہچانا جاتا ہے جو اتنی نمایاں ہوتی ہے کہ وہ اس کے لباس کو بھی ڈھک لیتی ہے۔

یہی ربانی شخصیت مومن کی اصل پہچان ہے۔ اس کو دیکھنا کسی گروہی امتیاز کو دیکھنا نہیں ہوتا۔ اس کو دیکھنا ایک ایسی ہستی کو دیکھنا بن جاتا ہے جو خدا کی یاد دلا دے، جو دیکھنے والے کے اوپر خدا کی حقیقتِ اعلیٰ کو منکشف کر دے۔

اسلامی شناخت یہ ہے کہ آدمی کا طرز فکر دوسروں سے مختلف ہو جائے۔ اس کے قول میں ایک نیا آہنگ پیدا ہو جائے۔ اس کا اخلاق دوسروں سے الگ دکھائی دینے لگے۔

زیادہ ثواب

قرآن کی سورہ النور میں ۵ھ میں پیش آنے والے اس واقعہ کا ذکر ہے جو اسلام کی تاریخ میں اِفک کے نام سے مشہور ہے۔ اس موقع پر مدینہ کے کچھ شر پسندوں نے حضرت عائشہ صدیقہؓ پر ایک جھوٹا الزام لگایا تھا۔ اس کے نتیجہ میں پورے شہر میں ایک ہنگامہ کھڑا ہو گیا۔ وقتی طور پر مسلمانوں کو سخت پریشانی کا سامنا کرنا پڑا تھا۔ اس کا تذکرہ کرتے ہوئے قرآن میں فرمایا گیا ہے کہ تم اس کو اپنے حق میں برا نہ سمجھو، بلکہ وہ تمہارے لیے بہتر ہے (لا تحسبوہ شراً لکم بل ھو خیر لکم) النور ۱۱

اس قسم کا فتنہ یا اس قسم کی شر انگیزی کیوں اہل ایمان کے لیے خیر ثابت ہوتی ہے، اس کے بہت سے پہلو ہیں۔ تاہم اس کا ایک خاص پہلو یہ ہے کہ ایسا ہر فتنہ پیچھے مومن کو یہ موقع دیتا ہے کہ وہ اس اعلیٰ ایمانی عمل کا ثبوت دے جس کو قرآن میں ظن خیر کہا گیا ہے (النور ۱۲) افواہوں کی آندھی میں حسن ظن کا طریقہ اختیار کر کے وہ مزید ثواب کمائے، وہ زیادہ بڑا عمل کر کے اللہ کی نظر میں زیادہ مقبول بندہ بن جائے۔

مثلاً الزام تراشی کی اس مہم میں جو لوگ شعوری یا غیر شعوری طور پر شریک ہو گئے ان میں سے ایک حسان بن ثابت انصاریؓ بھی تھے۔ چنانچہ بعد کو جب متحقق ہو گیا کہ یہ پورا قصہ سراسر جھوٹ پر مبنی تھا تو حسان بن ثابت کو ان کی غلطی پر کوڑے مارے گئے۔ مگر جہاں تک حضرت عائشہ کا تعلق ہے وہ کبھی حسان بن ثابتؓ سے متنفر نہیں ہوئیں۔ روایات میں آتا ہے کہ وہ اس کو سخت ناپسند کرتی تھیں کہ ان کے سامنے حسان کو برا کہا جائے (قال عروۃ وکانت عائشۃ تکرہ ان یُسبّ عندھا حسان) وہ حسان کے اشعار پڑھ کر کہا کرتی تھیں کہ حسان وہ ہیں جنھوں نے اسلام کی مدافعت میں ایسے اور ایسے اشعار کہے ہیں (التفسیر المظہری ۶/۲۷۳)

حضرت عائشہؓ کا یہ قول شرافت اور بلند اخلاق کی نہایت عظیم مثال ہے۔ یہی وہ کلمہ ہے جس کی بابت حدیث میں آیا ہے کہ ایسا ایک کلمہ آدمی کو جنت میں پہنچانے کے لیے کافی ہے۔ مگر اس قسم کے جنتی کلام کا کریڈٹ کسی کو ٹھنڈے حالات میں نہیں مل سکتا۔ یہ تو اسی وقت مل سکتا ہے جبکہ اس کے خلاف شر انگیزی اور فتنہ پردازی کا طوفان کھڑا کیا جائے مگر وہ مشتعل نہ ہو۔ اس کے باوجود وہ انصاف اور

خیر خواہی کی روش نہ چھوڑے۔ اس کے باوجود اس کی زبان سے دوسروں کے لیے خیر کا کلمہ نکلے۔ اس کے باوجود وہ دوسروں کا اعتراف کرے۔ اس کے باوجود وہ دوسروں کے حق میں نیک دعا کرے۔ وہ اپنے آپ کو پوری طرح منفی ردعمل سے بچائے اور ہر حال میں تقویٰ کی مثبت روش پر قائم رہے۔

اسی طرح روایات میں آتا ہے کہ مدینہ میں جب یہ بے ہودہ خبر پھیلی تو حضرت ابوایوب انصاریؓ اپنے گھر میں آئے۔ ان کی بیوی نے کہا کہ اے ابوایوب، آپ نے سنا کہ عائشہؓ کے بارہ میں کیا کہا جارہا ہے۔ ابوایوب انصاریؓ نے کہا کہ ہاں میں نے سنا۔ مگر وہ جھوٹ ہے۔ پھر انھوں نے اپنی بیوی سے پوچھا کہ اے ام ایوب، کیا تم ایسا کروگی۔ انھوں نے کہا کہ خدا کی قسم نہیں۔ ابوایوب انصاریؓ نے کہا: پھر عائشہ خدا کی قسم تم سے افضل ہیں۔ ان کی بیوی نے جواب دیا کہ ہاں، آپ نے صحیح کہا۔ (تفسیر قرطبی ۱۲/۲۰۶)

بعض روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ انھوں نے صفوان بن المعطل السلمی کا نام لیا جن کے ساتھ ظالموں نے حضرت عائشہ صدیقہ کو ملوث کیا تھا۔ ابوایوب انصاری نے کہا کہ میں خود اپنے بارہ میں سوچتا ہوں کہ اس وقت اگر میں صفوان کی جگہ پر ہوتا تو میرے دل میں اس طرح کا خیال تک نہیں آسکتا تھا۔ پھر صفوان تو مجھ سے اچھا مسلمان ہے، وہ کیوں کر ایسا سوچ سکتا تھا۔

یہی وہ چیز ہے جس کو قرآن میں قول سدید کہا گیا ہے۔ حضرت ابوایوب انصاریؓ نے یہ کیا کہ ایک سادہ منطق کو استعمال کر کے اسے پہلے ہی مرحلہ میں رد کر دیا۔ انھوں نے سوچا کہ کوئی بھی شریف انسان ایسا خیال اپنے دل میں نہیں لاسکتا۔ پھر کیسے مان لیا جائے کہ عائشہ صدیقہ جیسی شریف خاتون یا صفوان جیسا مخلص مومن اس قسم کی ذلیل بات کے مرتکب ہوسکتے ہیں۔

یہ ہنگامی واقعہ اگر نہ پیش آتا تو ابوایوب انصاری کو اس عظیم عمل کا انعام کیسے ملتا کہ ذہنی بھونچال کے وقت بھی انھوں نے اعتراف کا ثبوت دیا۔ ناموافق پروپگنڈوں کے باوجود انھوں نے اپنے آپ کو فکری اعتدال پر باقی رکھا۔ زلزلہ خیز حالات بھی اس میں کامیاب نہیں ہوئے کہ ان کے قدم کو حق وصداقت سے ہٹادیں۔

حسن ظن ایک ایسا عمل ہے جس کے لیے آدمی کو خود اپنے آپ سے لڑنا پڑتا ہے۔ یہی وہ چیز ہے جس نے حسن ظن کو خدا کی نظر میں ایک عظیم عمل بنادیا ہے۔

ایمان وعمل

ابن ماجہ نے اپنی حدیث کی کتاب کے مقدمہ میں ایک صحابی کا قول نقل کیا ہے کہ ہم نے ایمان کو سیکھا، اس سے پہلے کہ ہم قرآن کو سیکھیں (جب ہم نے ایمان سیکھ لیا) تو پھر ہم نے قرآن سیکھا (فتعلمنا الایمان قبل ان نتعلم القرآن، ثم تعلمنا القرآن)

اس کا مطلب یہ نہیں کہ ایمان کوئی ایسی چیز ہے جو قرآن سے الگ ہو۔ اور صحابہ کرام پہلے ایمان کو سیکھتے رہے۔ جب انھوں نے پوری طرح ایمان کو سیکھ لیا تو اس کے بعد قرآن کو سیکھنا شروع کیا۔ حقیقت یہ ہے کہ ایمان بھی قرآن ہی کا ایک حصہ ہے۔ ایمان کو بھی انھوں نے قرآن ہی کے ذریعہ سیکھا تھا نہ کہ کسی اور ذریعہ سے۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم مکہ میں قرآن ہی کے ذریعہ تبلیغ کرتے تھے۔ پھر جو لوگ اسلام قبول کر لیتے ان کی مزید تربیت کا کام بھی قرآن ہی کے ذریعہ ہوتا (لتنذر بہ وذکری للمومنین) مدینہ میں بھی یہی طریقہ اختیار کیا گیا۔ ہجرت سے پہلے قرآن کے کچھ عالم وہاں بھیجے گئے جو مقری کہے جاتے تھے۔ یعنی قرآن کو پڑھ کر سنانے والے۔ چنانچہ یہ لوگ ایک طرف غیر مسلموں تک قرآن کے ذریعہ اسلام کا پیغام پہنچاتے تھے اور دوسری طرف اسلام قبول کر لینے والوں کو قرآن کی تعلیم دیتے تھے۔

اصل یہ ہے کہ صحابی کے مذکورہ قول میں "قرآن" کا لفظ علم یا اسم خاص کے طور پر نہیں آیا ہے۔ بلکہ اپنے لغوی مفہوم میں استعمال ہوا ہے۔ یعنی کوئی پڑھی جانے والی چیز۔ اپنے سیاق کے اعتبار سے یہاں قرآن کا لفظ ان آیات کے لیے بولا گیا ہے جن کا تعلق عملی احکام سے ہے۔

اس مفہوم کے لیے بہت سی تائیدی مثالیں پیش کی جا سکتی ہیں۔ انھیں میں سے ایک یہ ہے کہ صلح حدیبیہ کے موقع پر حضرت عمرؓ نے اس کے خلاف شدت کا انداز اختیار کیا تھا۔ اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے کسی قدر تیز گفتگو کر لی تھی۔

بعد کو انھیں اپنی غلطی کا احساس ہوا۔ وہ کہتے ہیں کہ معاہدۂ حدیبیہ کی تکمیل کے بعد قافلہ میں ایک پکارنے والے کی آواز سنائی دی۔ میں ڈرا کہ کہیں میرے بارے میں کوئی قرآن نہ اترا ہو

(لقد خشیتُ ان یکون نزل فی القرآن) فتح الباری ۸/۴۴۶

اس روایت میں "قرآن" سے مراد پورا مصحف نہیں ہے۔ بلکہ اس سے مراد کوئی قرآنی حکم ہے۔ حضرت عمرؓ کو جوں کہ اپنی غلطی کا شدید احساس ہو چکا تھا اس لیے آواز سن کر وہ ڈر گئے کہ میرے بارہ میں کوئی حکم نہ اترا ہو۔ تحقیق کے بعد معلوم ہوا کہ وہ سورۂ فتح کی آیتیں تھیں۔ پکارنے والا دراصل سورہ فتح کی آیتیں بطور خوش خبری سنا رہا تھا۔

صحابی کے مذکورہ قول میں دونوں مرحلوں سے مراد قرآن اور غیر قرآن نہیں ہے۔ بلکہ اس سے مراد خود قرآن ہی کے دو حصے ہیں۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ پہلے ہم نے قرآن کے ایمانی حصہ سے اپنے فکر و شعور کی تعمیر کی جس کا دوسرا نام معرفت ہے۔ اس کے بعد فطری ترتیب کے مطابق، ہم نے قرآن کے عملی احکام کو سیکھا اور اس کو اپنی زندگیوں میں اختیار کیا۔

حقیقت یہ ہے کہ خود ایمان کی پختگی بھی قرآن ہی کے ذریعہ حاصل ہوتی ہے۔ قرآن کے علاوہ دوسرے ذریعہ سے حاصل کیا ہوا ایمان شریعت میں معتبر نہیں۔

یہ ترتیب فرد اور جماعت دونوں کے لیے ہے۔ جس طرح فرد کے اندر پہلے ایمانی شعور پیدا کیا جاتا ہے، اس کے بعد اس کو عملی احکام کی تلقین کی جاتی ہے۔ یہی معاملہ جماعت یا معاشرہ کا بھی ہے۔

کسی مسلم معاشرہ میں جب اسلام کے احکام و حدود کو نافذ کرنا ہو تو پہلے اس کی ایمانی حالت کا اندازہ کیا جائے گا۔ اگر ایمانی حالت کے اعتبار سے وہ زوال کی حالت میں ہو تو ایسا کرنا ہرگز اسلام نہیں ہوگا کہ قانون اور اقتدار کے زور پر اس کے اندر احکام و حدود نافذ کرنے کی کوشش کی جائے۔ اس کے بجائے پہلے معاشرہ کی ایمانی حالت کو درست کرنا ہوگا۔ جب وہ ایمان کی ضروری سطح پر پہنچ چکا ہو، اس کے بعد وہ مرحلہ آئے گا کہ اس کے اوپر اسلام کے اجتماعی قوانین کا نفاذ عمل میں لایا جائے۔

پہلے ہم نے ایمان سیکھا، پھر ہم نے قرآن سیکھا ——— اس کا مطلب یہ ہے کہ پہلے ہم نے قرآن کے حصۂ ایمان کو سیکھا، اس کے بعد ہم نے قرآن کے حصۂ احکام کو سیکھا۔ گویا پہلے مرحلہ میں شعور ایمان ہے اور دوسرے مرحلہ میں تعمیل احکام۔

دلیل نبوت

عن ابی سعید الخدری قال۔ قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم : اِنّ اکثرُ ما اَخافُ علیکم ما یُخرج اللہ لکم من برکات الارض۔ قیل وما برکات الارض۔ قال زَھرۃ الدنیا (فتح الباری ۱۱/۲۴۸)

حضرت ابوسعید خدریؓ کہتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔ تمہارے اوپر میں سب سے زیادہ اس سے ڈرتا ہوں کہ اللہ تمہارے اوپر زمین کی برکتیں نکال دے گا۔ پوچھا گیا کہ زمین کی برکتیں کیا ہیں۔ فرمایا: دنیا کی رونق۔

امام بخاری نے اس حدیث کو کتاب الرقاق کے تحت درج کیا ہے۔ یعنی وہ باب جس میں دل کو نرم کرنے والی باتیں ہیں۔ یہ بلاشبہ حدیث کا ایک پہلو ہے۔ اس کو پڑھ کر آدمی دنیا کے فتنہ کو سمجھتا ہے اور اس کے اندر آخرت کی طرف توجہ پیدا ہوتی ہے۔

تاہم اسی کے ساتھ اس حدیث کا ایک اور پہلو ہے۔ یہ حدیث دلائل نبوت میں سے ایک دلیل ہے۔ اس میں بتایا گیا ہے کہ آئندہ ایسا ہوگا کہ زمین کے اندر چھپی ہوئی برکتیں باہر آجائیں گی۔ اس کی رونق اور اس کی چمک دمک کو دیکھ کر تم فتنہ میں پڑ جاؤ گے اور دنیا کی طرف دوڑ پڑو گے۔

زمین کے اندر کی یہ برکتیں صنعتی انقلاب کے بعد نکل کر آج سب کے سامنے آگئی ہیں۔ چودہ سو سال پہلے ساری دنیا میں کوئی ایک شخص بھی ایسا نہ تھا جو یہ جانتا ہو کہ زمین کے اندر ایسی بارونق چیزیں چھپی ہوئی ہیں، اس کو صرف پیغمبر ہی جان سکتا تھا جس کا رشتہ براہ راست خدا سے جڑا ہوا ہو اور جو عالم الغیب سے معلومات لے کر بولتا ہو۔

یہ حدیث دراصل جدید صنعتی انقلاب کی پیشین گوئی ہے۔ اس انقلاب کے بعد جو پر رونق دنیا سامنے آئی ہے وہ تمام فتنوں سے زیادہ بڑا فتنہ ہے۔ اس کی دل فریبیاں تمام انسانوں کو اپنی طرف کھینچ رہی ہیں۔ یہ دنیا اتنی پرکشش ہے کہ ہر آدمی سب کچھ بھول کر اس کی طرف بھاگا چلا جا رہا ہے۔ خوش قسمت وہ ہے جو اس عظیم فتنہ سے بچ جائے۔ وہی وہ شخص ہے جس کو آخرت میں عظیم انعام دیا جائے گا۔ یہ حدیث مستقبل میں ہونے والے ایک واقعہ کو ماضی میں بتاتی ہے۔ وہ ایک نامعلوم کی پیشگی خبر ہے۔ اس اعتبار سے وہ آپؐ کے پیغمبر خدا ہونے کی دلیل ہے۔

جنگ کا قانون

وقاتلوا فی سبیل اللہ الذین یقاتلونکم ولا تعتدوا ان اللہ لا یحب المعتدین (البقرہ ۱۹۰)

اور اللہ کی راہ میں ان لوگوں سے لڑو جو تم سے لڑتے ہیں اور زیادتی نہ کرو۔ اللہ زیادتی کرنے والوں کو پسند نہیں کرتا۔

یہاں کہنا یہ تھا کہ جو لوگ تمہارے خلاف لڑائی چھیڑیں ان سے دفاع کے لیے لڑو۔ مگر دفاع کو حذف کر کے فرمایا کہ ان سے اللہ کے راستہ میں لڑو۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ مومن کا دفاع بھی اللہ کے لیے ہوتا ہے۔ وہ نفرت اور انتقام کے جذبہ کے تحت نہیں ہوتا بلکہ اس لیے ہوتا ہے کہ اللہ نے دفاع کرنے کی اجازت دی ہے۔ مومن کا ٹھہرنا بھی اللہ کے لیے ہوتا ہے اور اس کا چلنا بھی اللہ کے لیے۔

اسی ربانی جذبہ کی وجہ سے یہ ہوتا ہے کہ مومن کی جنگ صرف دفاع کی حد تک محدود رہتی ہے۔ جہاں دفاع کا مسئلہ ختم ہوا وہیں اس کی جنگ بھی ختم ہو جاتی ہے۔ اسی طرح مومن جنگ کے دوران ظالم نہیں بنتا۔ وہ صرف جنگجو افراد پر ہاتھ اٹھاتا ہے۔ وہ عورتوں اور بوڑھوں اور بچوں کو نہیں مارتا۔ وہ غیر مقاتلین کو اپنے انتقام کا نشانہ نہیں بناتا۔

"اور زیادتی نہ کرو" کا مطلب یہ ہے کہ تم خود کسی کے خلاف جارحیت کر کے جنگ کا آغاز نہ کرو۔ القرطبی نے اپنی تفسیر میں لکھا ہے کہ اور کہا گیا ہے کہ زیادتی نہ کرنے کا مطلب یہ ہے کہ جو تم سے جنگ نہ کرے تم بھی اس سے جنگ نہ کرو (وقیل "لا تعتدوا" ای لا تقاتلوا من لم یقاتل) الجامع لاحکام القرآن ۲/۳۵۰

اسلام کے مطابق، اصل مطلوب چیز امن ہے نہ کہ جنگ۔ اگر کوئی جنگ پر آمادہ ہو تو پہلی کوشش یہ ہوگی کہ جنگ کو کسی نہ کسی طرح ٹال دیا جائے۔ جب جنگ سے بچنے کی کوشش آخری حد تک ناکام ہو جائے اور فریق ثانی جنگ کا آغاز کر بیٹھے تو اس کے بعد آخری چارہ کے طور پر دفاعی جنگ کی جائے گی۔ مگر جہاں تک جارحانہ جنگ کا تعلق ہے، اسلام کسی حال میں اس کی اجازت نہیں دیتا۔

اسلام کا مقصد یہ ہے کہ فرد انسانی کے اندر ربانی شخصیت کی تعمیر کرے۔ یہ ایک تعمیری کام ہے جو صرف پر امن حالات ہی میں ہو سکتا ہے نہ کہ جنگ اور تشدد کے حالات میں۔

عوام وخواص

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی دعوت پر قدیم مکہ میں جن لوگوں نے اسلام قبول کیا، ان میں سے ایک نام رکانہ بن عبد یزید بن ہاشم بن المطلب بن عبد مناف کا ہے۔ وہ قریش کے پہلوانوں میں سے تھے۔ روایات کے مطابق، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور رکانہ میں کشتی ہوئی۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے رکانہ کو کشتی میں پچھاڑ دیا۔ اس کے بعد رکانہ نے اسلام قبول کرلیا۔

یہ کشتی کیسے ہوئی۔ اس سلسلہ میں ایک روایت یہ ہے کہ خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے رکانہ سے کہا: افرأیت إن صرعتك اتعلم أن ما (قول حق (اگر میں کشتی میں تم کو پچھاڑ دوں تو کیا تم جان لوگے کہ جو کچھ میں کہتا ہوں وہ حق ہے) البدایۃ والنہایۃ ۳/۱۰۳

دوسری روایت میں اس قول کو رکانہ کی طرف منسوب کیا گیا ہے۔ اس کے مطابق، رکانہ نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے کہا: إن صرعتنی علمت أنك صادق (اگر آپ کشتی میں مجھے پچھاڑ دیں تو میں جان لوں گا کہ آپ اپنے دعوے میں سچے ہیں) الکامل فی التاریخ ۲/۷۵

رکانہ کی طرح عمر بن الخطابؓ بھی قدیم مکہ کے پہلوانوں میں سے تھے۔ مگر نہ انھوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے کشتی میں پچھاڑنے کی بات کی اور نہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان سے ایسا کہا۔ اس کے برعکس عمر فاروقؓ نے قرآن کو پڑھا۔ اس کو پڑھنے سے ان پر حقیقت منکشف ہوئی اور انھوں نے اسلام قبول کرلیا۔

اصل یہ ہے کہ انسانوں میں دو قسم کے لوگ ہوتے ہیں۔ ایک عوام اور دوسرے خواص۔ عوام وہ ہیں جو پیدائشی طور پر کم تر ذہنی سطح سے تعلق رکھتے ہوں۔ اور خواص وہ ہیں جو بلند ذہنی سطح کے مالک ہوں۔ دونوں کی ذہنی ضرورتیں الگ ہیں اور دونوں کو ان کی ذہنی ضرورت یا ذہنی سطح کے مطابق اسلام کا پیغام دیا جاتا ہے۔

رکانہ کا تعلق عوام کے طبقہ سے تھا۔ وہ کشتی کی ہار جیت سے مطمئن ہو سکتے تھے۔ مگر عمر فاروق خواص کے طبقہ سے تعلق رکھتے تھے۔ وہ اعلیٰ ذہنی صلاحیت کے مالک تھے۔ اور اعلیٰ ذہن کے لوگ دلائل و حقائق سے متاثر ہوتے ہیں نہ کہ مذکورہ نوعیت کی کسی چیز سے۔

عوام وخواص یا کمتر ذہنی سطح اور اعلیٰ ذہنی سطح کی یہ تقسیم خود خالق فطرت کی قائم کردہ ہے۔ یہ فطری فرق تقاضا کرتا ہے کہ اسلام کی دعوت دو سطح پر چلائی جائے۔ ایک عوام کی سطح پر جہاں قصے اور مثالیں اور فضائل کی زبان میں لوگوں کو دین کی طرف متوجہ کیا جائے۔

دوسری سطح خواص کی ہے۔ یہاں لوگوں کو اسلام کا پیغام دلائل و حقائق کی زبان میں دینا ہوگا۔ یہاں اسلام کی تعلیمات کو اعلیٰ عقلی اسلوب میں ڈھال کر پیش کیا جائے گا۔ اسی لیے ایک صحابی نے کہا کہ لوگوں سے ان کے عقلی معیار کے مطابق بات کرو (کلم الناس علیٰ قدر عقولھم)

اس تقسیم کو توڑا نہیں جا سکتا۔ عوام کے سامنے اگر منطقی اسلوب یا دلائل کی زبان میں بات کی جائے تو وہ ان کے ذہن کو اپیل نہیں کرے گی۔ وہ اس سے فائدہ اٹھانے سے عاجز رہیں گے۔ اسی طرح اگر خواص کے سامنے عوام کی زبان میں بات کہی جائے تو وہ خواص کو متاثر کرنے میں ناکام ثابت ہوگی۔

اسلام کے احیاء کے لیے عوام اور خواص دونوں قسم کے لوگوں کی ضرورت ہے۔ اگر خواص دین سے دور ہوں تو صرف عوام میں دین کا پھیلنا احیاء اسلام کے لیے کافی نہیں ہو سکتا۔ اسی طرح اگر عوام میں دین نہ پھیلا ہو تو صرف خواص کا اسلام پسند بن جانا کوئی حقیقی انقلاب لانے کے لیے کافی نہیں ہوگا۔

اس لیے ضروری ہے کہ ہمارے درمیان ایسی تحریکیں جاری ہوں جو دو طرفہ تقاضوں کو پورا کرنے والی ہوں۔ ایک طرف وہ عوام کے اندر عمومی دینی فضا پیدا کریں۔ دوسری طرف خواص کے اندر ذہنی انقلاب پیدا کر کے انھیں دین کی خدمت کے لیے تیار کیا جائے۔ دین کی گاڑی پہلے بھی انھیں دونوں پہیوں کی یکجائی سے چلی تھی اور آج بھی وہ اسی طرح چلے گی۔ اس کے سوا کوئی دوسرا طریقہ دین کی گاڑی کو چلانے والا نہیں۔

دین میں آسانی

قرآن (البقرہ ۱۸۵) میں بتایا گیا ہے کہ اللہ تمہارے لیے آسانی چاہتا ہے، وہ تمہارے ساتھ سختی کرنا نہیں چاہتا (یرید اللہ بکم الیسر ولا یرید بکم العسر) دوسری جگہ (الحج ۷۸) فرمایا کہ اللہ نے تمہارے اوپر دین میں کوئی تنگی نہیں رکھی (وما جعل علیکم فی الدین من حرج)

حدیث میں ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ان ھذا الدین یسر (البخاری، کتاب الایمان) یعنی یہ دین آسان ہے۔ آپ نے فرمایا کہ تمہارا بہتر دین وہ ہے جو آسان ہو: ان خیر دینکم ایسرہ (مسند احمد) آپ نے نصیحت کرتے ہوئے فرمایا کہ تم لوگ آسانی پیدا کرو، لوگوں کو مشکل میں نہ ڈالو (یسروا ولا تعسروا)

اسی لیے فقہ میں شریعت کے بارہ میں یہ اصولی مسئلہ وضع کیا گیا ہے کہ: المشقۃ تجلب التیسیر۔ یعنی مشقت آسانی لاتی ہے۔ حنفی عالم زین الدین ابن ابراہیم بن محمد مصری (م ۹۷۰ھ) جو ابن نجیم کے نام سے مشہور ہیں، انھوں نے اصول فقہ پر اپنی کتاب الاشباہ والنظائر میں ایک بحث کا عنوان یہ قائم کیا ہے: القاعدۃ الرابعۃ، المشقۃ تجلب التیسیر (چوتھا قاعدہ اس بات پر کہ مشقت آسانی لاتی ہے)

اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ دین بذات خود کوئی سہولتوں اور آسانیوں کا مجموعہ ہے۔ اس کا اصل مطلب یہ ہے کہ دین کے راستہ میں جب حالات کے تحت کوئی مشقت کی صورت پیدا ہو جائے تو وہاں لوگوں کو مشقت میں نہیں ڈھکیلا جائے گا، بلکہ ان کے لیے آسانی پیدا کرنے کی کوشش کی جائے گی۔ اسی اصول کے تحت بیماری میں وضو کے بجائے تیمم ہے۔ سخت بارش میں مسجد کے بجائے گھر میں نماز پڑھنے کی اجازت ہے۔ سفر میں روزہ چھوڑ دینا ہے، وغیرہ۔

یہی اصول ملی زندگی کے لیے بھی ہے۔ جہاں اقدام کرنا موت کی طرف چھلانگ لگانے کے ہم معنی ہو وہاں اعراض کی تعلیم ہے۔ جہاں اجتماعی مظاہرہ میں نقصان کا اندیشہ ہو وہاں غیر مظاہراتی انداز اختیار کرنے کا حکم ہے۔ جہاں سیاسی اصلاح کو نشانہ بنانے میں ہلاکت پیش آنے والی ہو وہاں انفرادی اصلاح پر اپنی کوششوں کو لگانا ہے۔ جہاں شور والے دین میں تباہی ہو وہاں خاموشی والا دین اختیار کر لینا ہے۔

دین میں آسانی کا یہ اصول صرف فرد کے لیے نہیں ہے، وہ جماعت اور قوم کے لیے بھی ہے۔ جس طرح انفرادی معاملات میں مشکل پیش آنے کی صورت میں فرد کے لیے شریعت کا حکم نرم کر دیا جاتا ہے۔ اسی طرح جماعت کے لیے بھی سخت حالات میں شریعت اپنے تقاضے کو نرم کر دیتی ہے۔

دینی مقصد کے لیے اقدام کرنا بجائے خود ثواب کا ایک عمل ہے۔ مگر جہاں ایسی صورت حال پیدا ہو جائے کہ اقدام کرنا موت کی طرف چھلانگ لگانے کے ہم معنی ہو وہاں شریعت کا حکم بدل جائے گا۔ اب اقدام کے بجائے اعراض اہل اسلام کے لیے شریعت کا مطلوب عمل بن جائے گا۔

اسی طرح مثلاً شریعت کا ایک عمل ہے جس کو اجتماعی صورت میں کرنا مطلوب ہے۔ لیکن اگر حالات ایسے ہوں کہ مظاہرہ میں نقصان کا اندیشہ ہو تو وہاں حکم میں نرمی پیدا کر دی جائے گی۔ اب مظاہراتی انداز کے بجائے غیر مظاہراتی انداز اختیار کرنے کا حکم دے دیا جائے گا۔

اسی طرح ایک معاشرہ ہے جہاں سیاسی اصلاح کی ضرورت ہے۔ لیکن حالات بتاتے ہیں کہ اگر سیاسی تبدیلی کو نشانہ بنا کر تحریک چلائی جائے تو ہلاکت کی صورت پیش آجائے گی تو ایسے معاشرہ میں لوگوں کو ہلاکت میں ڈالنے کے بجائے خود حکم کو بدل دیا جائے گا۔ اب وہاں یہ مطلوب ہو جائے گا کہ سیاسی انقلاب کے محاذ سے ہٹ کر انفرادی اصلاح کے میدان میں پرامن کوششیں کی جائیں۔

اسی طرح ایک موقع جہاں اعلان و اظہار ایک شرعی مطلوب نظر آتا ہے۔ مگر اسی کے ساتھ یہ یقین ہے کہ اگر لاؤڈ اسپیکر کی پرشور تقریر کا طریقہ اختیار کیا جائے تو اس کا منفی ردعمل ہوگا اور اہل اسلام کے لیے شدید تر حالات پیدا ہو جائیں گے۔ تو ایسے حالات میں شور والا عمل ساقط ہو جائے گا، اور شریعت کا تقاضا ہو جائے گا کہ خاموش تدبیر کا انداز اختیار کر کے اپنا مقصد حاصل کیا جائے۔

عُسر سے بچنا اور یُسر کا طریقہ اختیار کرنا یہ ہے کہ بوقت عمل یہ دیکھا جائے کہ موجودہ حالات میں کیا چیز ممکن ہے اور کیا چیز ممکن نہیں ہے۔ اور پھر ممکن دائرہ میں اپنی قوتوں کو صرف کیا جائے، نہ کہ ناممکن دائرہ میں سر ٹکرا کر مزید اپنے نقصان میں اضافہ کر لیا جائے۔

خودکشی کی چھلانگ

دہلی کے روزنامہ ہندستان ٹائمس (۱۷ نومبر ۱۹۹۵) کے پہلے صفحہ پر ایک باتصویر کہانی چھپی ہے۔ یہ ایک مُردہ کی کہانی ہے جو زندہ لوگوں کو دردناک سبق دے رہی ہے۔

دہلی کے مسٹر ایم این اورا کی ۲۰ سال بھتیجی ساریکا ہورا (Sarika Hora) پونہ میں انجینیرنگ کے تیسرے سال کی اسٹوڈنٹ تھی۔ اکتوبر ۱۹۹۵ میں وہ اپنی فیملی کے ساتھ دیوالی منانے کے لیے دہلی آئی۔ ۲۷ اکتوبر کو نظام الدین ریلوے اسٹیشن سے وہ گوا اکسپرس پر سوار ہوئی تاکہ پونہ پہنچ کر وہ دوبارہ اپنے اکیڈمک سیشن میں شامل ہو سکے۔

ریلوے اسٹیشن پر اس کے گھر والوں نے اس کو رخصت کیا۔ وہ اپنے ایک ساتھی طالب علم کے ہمراہ نہایت خوش وخرم اپنی منزل کی طرف جا رہی تھی۔ اس ٹرین کے ہر دو ڈبہ کے درمیان اندرونی گزر گاہ بنی ہوئی تھی۔ ٹرین گوالیار اور جھانسی کے درمیان تھی کہ پرشوق لڑکی اٹھی تاکہ ایک کوچ سے دوسری کوچ میں جا سکے۔ وہ کوچ کی دہلیز (vestibule) میں پہنچی۔ یہاں قاعدہ کے مطابق، دونوں کوچ کے درمیان گزرنے کی پلیٹ (stepping plate) ہونی چاہیے تھی۔ مگر کسی وجہ سے وہ وہاں موجود نہ تھی۔ لڑکی نے اس کی پروانہ کی۔ اس نے چاہا کہ قدم بڑھا کر وہ اِس کوچ سے اُس کوچ میں پہنچ جائے۔ مگر وہ اس میں کامیاب نہیں ہوئی۔ اس کا پاؤں اگلی کوچ تک پہنچنے کے بجائے درمیان کی خالی جگہ پر پڑ گیا۔ اچانک وہ تیز دوڑتی ہوئی ریل کے نیچے چلی گئی اور سکنڈوں میں اس کا جسم ٹکڑے ٹکڑے ہو گیا۔

یہ صرف ریل کے سفر کی بات نہیں۔ زندگی کے وسیع تر سفر میں بھی بار بار ایسے مواقع آتے ہیں جب کہ ہمیں ایک حالت سے دوسری حالت تک پہنچنے کے لیے کسی گزرنے والی پلیٹ (stepping plate) کی ضرورت ہوتی ہے۔ ایسے موقع پر سب سے پہلا کام یہ ہوتا ہے کہ ٹھہر کر دیکھا جائے کہ ہمارے لیے فی الواقع کوئی قابل اعتماد پلیٹ موجود ہے جس سے گزر کر ہم آگے کی طرف جا سکیں۔ ایسی قدم گاہ کی غیر موجودگی میں گزرنے کی کوشش کرنا خودکشی کی چھلانگ لگانا ہے نہ کہ ترقی اور کامیابی کی طرف اپنا سفر طے کرنا۔

کیا کوئی سبق لینے والا ہے جو اس واقعہ سے سبق لے۔

پوپ کے جواب میں

پوپ جان پال دوم کی ایک کتاب ۱۹۹۴ میں چھپی ہے۔ اس کا ترجمہ بہت سی عالمی زبانوں میں شائع ہو چکا ہے۔ اس کتاب کے ایک باب کا عنوان محمد (Muhammad) ہے۔ اس مختصر باب میں اسلام پر اظہار رائے کیا گیا ہے۔ وہ لکھتے ہیں :

جو شخص بھی پرانے عہد نامہ اور نئے عہد نامہ کو جانتا ہے، اور پھر وہ قرآن کو پڑھتا ہے۔ وہ واضح طور پر اس عمل کو دیکھتا ہے جس کے ذریعہ وہ مکمل طور پر خدائی اظہار کو گھٹا رہا ہے، یہ ناممکن ہے کہ آدمی اس کو نوٹ نہ کرے کہ قرآن کا بیان اس سے الگ ہے جو خدا نے اپنے بارہ میں کہا ہے، سب سے پہلے پرانے عہد نامہ میں پیغمبروں کے ذریعہ، اور پھر آخری طور پر نئے عہد نامہ میں اپنے بیٹے کے ذریعہ۔ خدا کے خود ظاہر ہونے کا قیمتی پہلو، جو کہ پرانے عہد نامہ اور نئے عہد نامہ کا حصہ ہے، وہ قطعی طور پر اسلام میں بالائے طاق رکھ دیا گیا ہے۔ انسانی زبان کے کچھ بہت ہی خوب صورت نام قرآن میں خدا کو دیے گئے ہیں لیکن آخری طور پر وہ دنیا سے باہر کا ایک خدا ہے۔ ایک ایسا خدا جو صرف عظیم ہے، وہ ایسا خدا نہیں جو ہمارے ساتھ ہو۔ اسلام ہرگز نجات کا مذہب نہیں (اصل عبارت نیچے ملاحظہ فرمائیں)

پوپ کی اس عبارت کا مطلب یہ ہے کہ اسلام میں خدا کو ایک غیبی حقیقت کے طور پر مانا گیا ہے۔ وہ ایک محسوس وجود کی صورت میں انسان کے پاس موجود نہیں ہوتا۔ اس کے برعکس مسیحی مذہب میں تجسیم (incarnation) کا تصور ہے۔ یعنی خدا (کا بیٹا) انسان جیسے گوشت اور خون کی صورت میں انسان

Whoever knows the Old and New Testaments, and then reads the Koran, clearly sees the process by which it completely reduces Divine Revelation. It is impossible not to note the movement away from what God said about Himself, first in the Old Testament through the prophets, and then finally with New Testament through His Son. In Islam all the richness of God's self-revelation, which constitutes his heritage of the Old and New Testaments, has definitely been set aside. Some of the most beautiful names in the human language are given to the God of the Koran, but He is ultimately a God outside of the world, a God who is only Majesty, never Emmanuel, God-with-us. Islam is not a religion of redemption.

Crossing the Threshold of Hope, by Pope John Paul II
Alfred A. Knopf, New York 1994, pp. 92-93.

کے پاس آیا۔ اس بنا پر پوپ کا دعویٰ ہے کہ مسیحی تصور خدا میں قربت کا پہلو پوری طرح موجود ہے، جب کہ اسلام میں یہ ناممکن ہے کہ انسان اپنے اور خدا کے درمیان حقیقی قربت کا تجربہ کر سکے۔ اس سے پوپ نے یہ نتیجہ نکالا ہے کہ اسلام نجات کا مذہب نہیں ہو سکتا۔ کیوں کہ جو مذہب آدمی کو خدا سے نہ ملاتا ہو وہ اس کی نجات کا ذریعہ کیسے بنے گا۔

۱۔ پوپ کی اس بات کو زیر بحث لانے کے لیے سب سے پہلے یہ ثابت ہونا چاہیے کہ بائبل کا بیان زیادہ مستند ہے، مگر یہ کسی طرح ثابت نہیں کیا جا سکتا۔ کیوں کہ بائبل (پرانا عہد نامہ، نیا عہد نامہ) کی تاریخی تحقیق کرنے والے تمام علماء یہ کہتے ہیں کہ بائبل اپنی اوریجنل صورت میں موجود ہی نہیں۔ بار بار کی تبدیلی اور الحاق نے اس کو تاریخی طور پر ایک غیر مستند کتاب بنا دیا ہے۔

ایسی حالت میں پوپ کا مذکورہ دعویٰ اپنے پہلے مرحلہ ہی میں رد ہو جاتا ہے جب بائبل قابل اعتبار کتاب نہیں تو اس کے کسی بیان پر استدلال کی عمارت کیسے کھڑی کی جا سکتی ہے۔

۲۔ اس سے قطع نظر، پوپ کی یہ بات ایک غلط مفروضہ پر اپنی عمارت کھڑی کرنے کے ہم معنی ہے جس کو منطق کی اصطلاح میں بنا رفاسد علی الفاسد کہا جاتا ہے۔ ان کا یہ ابتدائی مفروضہ ہی درست نہیں کہ خدا اور انسان کے درمیان قربت کے لیے ضروری ہے کہ خدا خود انسان کے روپ میں ظاہر ہو۔ کیونکہ خدا اور انسان کی قربت کسی لمسِ جسمانی کا نام نہیں ہے۔ وہ ایک ایسی قربت ہے جو مکمل طور پر نفسیات کی سطح پر قائم ہوتی ہے۔ حتی کہ بالفرض اگر خدا ہمارے سامنے موجود ہو تب بھی نفسیات کی سطح پر ہی اس سے ہماری قربت قائم ہوگی نہ کہ ظاہری جسم کی سطح پر۔

اتصال نام ہی ہے روحانی اتصال کا۔ خود انسانوں کے درمیان بھی تمام اعلیٰ اتصال روحانی اتصال ہوتے ہیں۔ مثلاً دوست کا دوست سے ملنا حقیقۃً دو جسموں کا ملنا نہیں ہوتا بلکہ دو روحوں کا ملنا ہوتا ہے۔ اسی لیے دو مُردہ دوست اگر پاس پاس رکھ دیے جائیں، تو اگرچہ ان کے جسم ایک دوسرے سے متصل ہوں گے، مگر روح نہ ہونے کی وجہ سے دونوں اتصال کے تجربہ سے محروم ہوں گے۔

حقیقت یہ ہے کہ خدا اور بندے کا اتصال دو اسٹیچو کا اتصال نہیں ہے، بلکہ وہ روح اکبر کے ساتھ روح اصغر کا اتصال ہے۔ اسی بنا پر اس کی اہمیت ہے۔ اگر وہ محض دو جسموں کا اتصال ہوتا تو سرے سے اس کی کوئی اہمیت ہی نہ ہوتی۔

۳- پوپ جان پال دوم نے قربت خداوندی کی جو نوعیت بتائی ہے وہ مذہبی طور پر قطعاً غیر ثابت شدہ ہے۔ وہ تحریفات کے بعد بھی پرانے عہد نامہ یا نئے عہد نامہ (تورات و انجیل) میں موجود نہیں ہے۔ قدیم و جدید عہد نامہ کے پورے دفتر میں کوئی بھی عبارت ایسی نہیں ہے جو صراحت اور قطعیت کے ساتھ پوپ کے مذکورہ بیان کی تصدیق کرتی ہو۔ گویا کہ یہ ایک ایسا دعویٰ ہے جس کے حق میں کوئی کھلی دلیل خود کتب قدیمہ میں بھی موجود نہیں۔

اس سلسلہ میں کتب قدیمہ سے اگر کوئی حوالہ دیا جاتا ہے تو وہ استنباطی نوعیت کا ہے۔ مثلاً اس سلسلہ میں اکثر یوحنا کی انجیل کا یہ فقرہ نقل کیا جاتا ہے کہ اور کلام مجسم ہوا :

The Word became flesh. (John 1:14)

مگر اس عبارت میں پوپ کا مذکورہ نظریہ ہرگز موجود نہیں۔ وہ صرف استنباطی طور پر اس سے نکالا جاتا ہے۔ اور ایک ایسا نظریہ جس کو مسیحیت کا مرکزی اصول (central doctrine) کہا جاتا ہے، اگر وہ استنباط کے ذریعہ ثابت کیا جائے تو بجا طور پر کہا جا سکتا ہے کہ وہ ثابت ہی نہیں ہوا۔

کوئی شخص انجیل کی مذکورہ آیت یا اسی قسم کی کسی اور آیت سے استنباطی طریقہ پر اس کی تائید نکالے تو وہ تائید ہرگز کافی نہیں ہوگی۔ اتنا زیادہ بنیادی عقیدہ صرف اس وقت کسی کتاب سے ماخوذ قرار دیا جا سکتا ہے جب کہ وہ براہ راست طور پر اس کے متن سے نکل رہا ہو۔ اگر اس کو تشریح و تعبیر کر کے نکالا جائے تو یقینی طور پر وہ نکلا ہی نہیں۔ اس طرح کے امور میں صرف براہ راست استدلال کارآمد ہوتا ہے، بالواسطہ استدلال اس طرح کے امور میں کارآمد نہیں۔

۴- اگر اس بے بنیاد عقیدہ کو برائے بحث مان لیا جائے کہ خدا (یا خدا کا بیٹا) حضرت مسیح کے روپ میں دنیا میں آیا تب بھی قربت خداوندی کا یہ عقیدہ ناقابل عمل قرار پاتا ہے۔ کیوں کہ مسیح کی زندگی میں بھی چند ہی لوگ اور وہ بھی محض کچھ لمحہ کے لیے جسمانی اعتبار سے مسیح کے قریب ہو سکے۔ اور اب حضرت مسیح کی غیر موجودگی میں تو تمام ہی لوگ مستقل طور پر قربت کے اس تجربہ سے محروم ہیں۔ آج اگر کسی کو مسیح کی قربت حاصل ہوگی تو وہ نفسیاتی سطح پر ہی حاصل ہوگی۔ پھر دونوں مذہبوں کے تصور قربت میں کیا فرق باقی رہا۔

۵- اسلام میں خدا کا جو تصور دیا گیا ہے وہ کوئی دور کا خدا نہیں ہے، بلکہ وہ ایسا خدا ہے جو انسان سے بالکل قریب ہے (البقرہ ۱۸۶) قرآن میں بتایا گیا ہے کہ انسان جب ایک سچا سجدہ کرتا

ہے تو وہ خدا سے آخری حد تک قریب ہو جاتا ہے (العلق ۱۹) اسی طرح حدیث میں بتایا گیا ہے کہ اللہ کی عبادت اس طرح کرو گویا کہ تم اسے دیکھ رہے ہو (تعبد اللہ کانک تراہ) اور یہ کہ آدمی جب دعا کرتا ہے تو وہ اپنے رب سے سرگوشی کر رہا ہوتا ہے (بخاری و مسلم)

اس طرح کی آیتیں اور حدیثیں بتاتی ہیں کہ اسلام میں خدا کا جو تصور دیا گیا ہے وہ یہ نہیں ہے کہ خدا اور انسان کے درمیان قربت کا تعلق نہیں ہے بلکہ صرف دوری کا تعلق ہے۔ اصل معاملہ اس کے بالکل برعکس ہے۔ قرآن میں بتایا گیا ہے کہ جو اہل ایمان ہیں وہ خدا سے بہت زیادہ محبت کرنے والے ہوتے ہیں (البقرہ ۱۶۵) یہی واقعہ بتاتا ہے کہ اسلام اپنے ماننے والوں کو خدا سے ملانے والا ہے۔ کیوں کہ آدمی جب تک قربت کا احساس نہ کرے، اس کو کبھی خدا کے ساتھ حب شدید کا تعلق نہیں ہو سکتا۔

۶۔ قرآن کے مطابق (حتی کہ خود کتب قدیمہ کے مطابق) خدا سے قربت و اتصال غیر مرئی سطح پر ہوتا ہے۔ اسی لیے قرآن میں ذکر اور دعا اور غور و فکر پر بہت زیادہ زور دیا گیا ہے۔ یہ ذہنی یا قلبی اعمال دراصل اپنے اندر اعلیٰ روحانیت کو جگانے کے لیے ہیں۔ یہ اعلیٰ روحانیت جب کسی کے اندر جاگ اٹھے تو کسی تاخیر کے بغیر فوراً ہی اس کا اتصال خدا کے ساتھ قائم ہو جاتا ہے۔ اس میں نہ وقت اور مقام کی کوئی شرط ہے اور نہ کسی قسم کے درمیانی واسطہ کی ضرورت۔

بندہ جب خدا کی یاد میں غرق ہوتا ہے۔ وہ اس کو دل کی گہرائیوں کے ساتھ پکارتا ہے۔ جب وہ اپنی سوچ کو پوری طرح اپنے رب کی طرف مرتکز کر دیتا ہے تو فوراً ہی ایک ایسا واقعہ پیش آتا ہے جس کو لفظوں میں بیان نہیں کیا جا سکتا۔ یہ خداوند ذوالجلال کے ساتھ روحانی سطح پر انسان کا اتصال ہے۔

اس اتصال کی علامت کے طور پر انسان کا دل نرم ہو جاتا ہے۔ اس کے جسم کے رونگٹے کھڑے ہو جاتے ہیں۔ اس کی آنکھوں سے آنسو بہنے لگتے ہیں۔ اس کو محسوس ہوتا ہے کہ اس کے سینہ میں ایک آفاقی سکون اتر آیا ہے۔

یہی خدا اور بندے کا اتصال ہے۔ یہ اتصال سب سے زیادہ اسلام میں حاصل ہوتا ہے۔ کیوں کہ اسلام انسان کو کسی ظاہری یا غیر متعلق چیز پر نہیں اٹکاتا، بلکہ وہ اس کو براہ راست

خداوند عالم سے مربوط کرتا ہے۔ وہ انسان کی لامحدود اندرونی شخصیت کو بیدار کرتا ہے۔ اور جس انسان کی اندرونی شخصیت پوری طرح بیدار ہو جائے اس کا خدا سے اتصال اتنا ہی یقینی ہو جاتا ہے جتنا کہ کنکشن درست ہونے کے بعد بلب اور پاور ہاؤس کے درمیان رشتۂ نور کا قائم ہو جانا۔

نئی مطبوعات

از مولانا وحید الدین خان

فکرِ اسلامی	قیمت :	۵۰/-	روپے
قیادت نامہ	〃 〃	۳۰/-	〃 〃
کتابِ زندگی	〃 〃	۵۵/-	〃 〃
ڈائری	〃 〃	۸۰/-	〃 〃

خصوصی اعلان

دفتر میں ماہنامہ الرسالہ کے پرانے متفرق شمارے (اردو، ہندی اور انگلش تینوں زبانوں میں) بڑی تعداد میں جمع ہو گئے ہیں، جس کو افادۂ عام کی غرض سے نہایت ارزاں قیمت پر فراہم کرنے کا فیصلہ کیا گیا ہے۔ ایک شمارہ کی قیمت ۲ روپے ہوگی۔ جب کہ ۱۰۰ یا اس سے زائد شمارے منگوانے کی صورت میں مزید ایک روپے کی تخفیف کر دی جائے گی۔ یعنی ۱۰۰ روپے میں ۱۰۰ شمارے۔ نیز ڈاک خرچ بھی مکتبہ کے ذمہ ہوگا۔

قارئین سے گزارش ہے کہ وہ بطورِ خود اور مقامی اصحابِ خیر کو ترغیب دے کر اس پروگرام میں زیادہ سے زیادہ حصہ لیں۔ تاکہ الرسالہ کے دعوتی اور تعمیری مشن سے وہ لوگ بھی آشنا ہو جائیں جو اب تک کسی وجہ سے آشنا نہ ہو سکے۔

منیجر ماہنامہ الرسالہ

دو ہجرتیں

۱۹۲۰ میں مولانا ابوالکلام آزاد اور مولانا عبدالباری فرنگی محلی وغیرہ نے ہجرت کا فتویٰ دیا تھا۔ اخبار اہل حدیث امرت سر کے شمارہ ۲۰ جولائی ۱۹۲۰ میں یہ فتویٰ ان الفاظ میں چھپا تھا:

"تمام دلائل شرعیہ، حالات حاضرہ، مصالح مہمۂ امت اور مقتضیات و مصالح پر نظر ڈالنے کے بعد پوری بصیرت کے ساتھ اس اعتقاد پر مطمئن ہو گیا ہوں کہ مسلمانانِ ہند کے لئے بجز ہجرت کوئی چارۂ شرعی نہیں ہے۔ ان تمام مسلمانوں کے لئے جو اس وقت ہندستان میں سب سے بڑا اسلامی عمل انجام دینا چاہیں ضروری ہے کہ وہ ہندستان سے ہجرت کر جائیں۔" (تحریک خلافت، از قاضی محمد عدیل عباسی، ترقی اردو بیورو، نئی دہلی، ۱۹۸۲، صفحہ ۱۳۲)

اس فتوے کے مطابق بہت سے مسلمان ہجرت کر کے افغانستان چلے گئے۔ یہ سفر ان کے لئے سفر ہجرت کے بجائے سفر بربادی بن گیا۔ بے پناہ تباہی کے بعد کچھ لوگ مر گئے، کچھ لوگ مایوسی اور دل شکستگی کے ساتھ واپس آ گئے۔ (تفصیل کے لئے ملاحظہ ہو: ظفر حسن ایبک کی آپ بیتی)

مولانا ابوالکلام آزاد اور دوسرے علماء نے ہجرت کا یہ فتویٰ کیوں دیا۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ ۱۸۵۷ میں علماء نے انگریزوں کے خلاف مسلح جہاد شروع کیا۔ ساٹھ سال سے زیادہ مدت کے تجربہ سے معلوم ہوا کہ یہ جہاد یک طرفہ طور پر مسلمانوں کی تباہی کا سبب بن رہا ہے۔ ایسی حالت میں یہ سوال تھا کہ اب کیا کیا جائے۔ ان علماء نے سمجھا کہ اب انھیں ہجرت کر کے پڑوس کے مسلم ملک میں چلا جانا چاہئے اور وہاں سے مدد حاصل کر کے اور مزید تیاری کر کے دوبارہ ہندستان پر حملہ کرنا چاہئے۔ اس طرح انگریزوں کو یہاں سے نکالنا چاہئے۔

یہ ان علماء کی اجتہادی غلطی تھی۔ یہ اجتہادی غلطی ان سے اس لئے ہوئی کہ انھیں 'ہجرت' کے لفظ سے صرف ایک ہی قسم کی ہجرت کا علم تھا۔ یعنی مکہ سے مدینہ کی طرف ہجرت۔ انھیں ایک اور ہجرت کا پتہ نہیں تھا، صرف اس لئے کہ اس کا نام قدیم کتابوں میں ہجرت کے بجائے حد پیہ لکھا ہوا ہے۔

ہجرت بجائے خود ایک اہم اسلامی فریضہ ہے۔ مگر ہجرت کی دو صورتیں ہیں۔ ایک مکانی ہجرت اور دوسرے تدبیری ہجرت۔ مکہ سے مدینہ جانا یہ مکانی ہجرت تھی اور حدیبیہ کا معاہدہ تدبیری ہجرت تھی۔ کیوں کہ اس معاہدہ میں یہ طے کیا گیا تھا کہ اب تک دونوں فریقوں کے درمیان جو جنگ جاری تھی اس کو بند کر دیا جائے۔ دونوں میں سے کوئی ایک دوسرے پر حملہ نہ کرے اس طرح حدیبیہ نے میدان عمل کو بدل دیا۔

گویا کہ صلح حدیبیہ متشددانہ عمل (violent activism) سے غیر متشددانہ عمل (non-violent activism) کی طرف ہجرت تھی۔ اس صلح کے ذریعہ فریق ثانی کو عدم جارحیت کا پابند کر دیا گیا اور اس طرح اہل اسلام کے لئے پرامن دعوت یا غیر متشددانہ عمل کا راستہ کھل گیا۔

عجیب بات ہے کہ مولانا ابوالکلام آزاد اور دوسرے علما کی سمجھ میں یہ دوسری ہجرت نہ آسکی۔ البتہ مہاتما گاندھی نے اس راز کو پالیا جنھوں نے اسلام کا گہرا مطالعہ کیا تھا۔ چنانچہ ۱۹۲۰ میں جب کہ علما مسلمانوں کو ہجرت مکانی کی دعوت دے رہے تھے، عین اس وقت مہاتما گاندھی نے اہل وطن کو ہجرت تدبیری کا پیغام دیا۔ انھوں نے کہا کہ اب تک ہم تشدد کے ذریعہ ہندستان کی آزادی کی جدوجہد چلا رہے تھے۔ یہ طریقہ کامیاب ثابت نہیں ہوا۔ اب ہم کو تشدد کا طریقہ چھوڑ کر عدم تشدد کے طریقہ پر اپنی تحریک چلانا چاہئے۔

عدم تشدد کے ہتھیار سے مراد تھا دلیل کا ہتھیار۔ یہ دوسرا ہتھیار ہندستانیوں کے حق میں نہایت مؤثر ثابت ہوا۔ تشدد کے طریقہ میں انگریزی حکومت زیادہ طاقت ور ثابت ہو رہی تھی۔ اور ہندستانی لوگ اس کے مقابلہ میں کمزور فریق بنے ہوئے تھے۔ مگر جب عدم تشدد کا طریقہ اختیار کیا گیا تو اچانک ہندستانیوں کا پلہ بھاری ہو گیا۔ کیوں کہ اب مقابلہ ہتھیار کے میدان کے بجائے نظریات کے میدان میں منتقل ہو گیا۔

مشینی انقلاب نے انگریزوں کو زیادہ بہتر ہتھیار دئے تھے۔ مگر دلیل اور نظریہ کے میدان میں معاملہ اس کے برعکس تھا۔ اس دوسرے میدان میں انگریزوں کے پاس اس سوال کا کوئی جواب نہ تھا کہ وہ باہر کے دیش سے آکر کیوں ہندستان میں حکومت کریں۔ جب کہ

ہندستانی لیڈروں کے پاس یہ مضبوط دلیل تھی کہ ہم اس ملک کے باشندے ہیں۔ اس لئے دنیا بھر کے مسلمہ اصول کے مطابق ہم کو حق ہے کہ ہم اپنے ملک میں اپنی مرضی کی حکومت بنائیں۔ انگریز کے پاس نظریۂ استعمار تھا اور گاندھی کے پاس نظریۂ خود اختیاری۔ پہلے کے مقابلہ میں دوسرا نظریہ واضح طور پر برتر ثابت ہوا۔ اور انگریز کو یہاں سے نکل جانا پڑا۔

یہ ہجرت تدبیری مہاتما گاندھی کی سمجھ میں آئی مگر وہ علماء اسلام کی سمجھ میں نہ آسکی۔ اسی لئے ہم دیکھتے ہیں کہ ۱۹۲۰ سے پہلے کے دور میں آزادئ ہند کی تحریک میں علماء سیاسی امام کا درجہ حاصل کئے ہوئے ہیں۔ مگر ۱۹۲۰ کے بعد کے دور میں اچانک وہ مقتدی بن کر رہ جاتے ہیں۔ چنانچہ مولانا محمود حسن صاحب سے لے کر مولانا آزاد تک تمام علماء نے مہاتما گاندھی کو اپنا سیاسی قائد تسلیم کر لیا۔

آج دوبارہ یہی صورتحال ہمارے سامنے ہے۔ مسلمانوں کے کچھ نادان دوست مسلمانوں سے یہ کہہ رہے ہیں کہ "مسلم کش" فسادات سے نجات کا راستہ ہجرت ہے۔ ان کا کہنا ہے کہ ملک میں سازش کے تحت فرقہ وارانہ فساد کرایا جاتا ہے۔ مسلمان اگر ان فسادات میں دفاع کے اصول کے تحت مقابلہ کرتے ہیں تو عددی فرق کی بنا پر مسلمانوں کا دفاع غیر مؤثر ہو جاتا ہے۔ ایسی حالت میں اسلام کے اصول ہجرت کے تحت مسلمانوں کو اپنے مقامات سے ہجرت کر جانا چاہئے۔ اس سے ان کی مراد داخلی ہجرت ہے۔ یعنی مسلمان ملک کے اندر اپنے علیحدہ پاکٹ بنائیں اور منتشر آبادیوں سے نکل کر ان مخصوص علاقوں میں آباد ہو جائیں۔ ایک صاحب لکھتے ہیں:

"ہندستانی مسلمانوں کی بے وقعتی کا راز، باوجود ۲۰ کروڑ کی آبادی کے یہ ہے کہ وہ گاؤں گاؤں اور شہر بہ شہر پھیلے ہوئے ہیں۔ اپنی عددی قوت بڑھانے اور اکثریت میں تبدیل ہونے کے لئے ضروری ہے کہ وہ ہجرت کر کے بعض پہلے سے طے شدہ علاقوں میں منتقل ہو جائیں۔ یعنی مسلمان ملک کے اندر ہی نقل مکان کریں۔ جہاں مسلمانوں کا تناسب آبادی کم ہے، ان علاقوں کو غیر محفوظ قرار دے کر محفوظ علاقوں کی طرف ہجرت کر جائیں (افکار ملی۔ دہلی، مارچ ۱۹۹۴، صفحہ ۶۲)

یہ اس نادانی کا اعادہ ہے جو ۱۵۰۰ سال پہلے کی گئی تھی۔ اس قسم کی ہجرت بلاشبہ ہلاکت خیز حد تک غلط ہے۔ اس کا تعلق نہ اسلام سے ہے اور نہ عقل سے۔

یہ ایک قسم کی خلاف زمانہ حرکت (anachronism) ہے۔ جو لوگ اس قسم کی باتیں کرتے ہیں وہ فکر کے اعتبار سے ابھی تک قبائلی دور میں جی رہے ہیں۔ قبائلی دور میں جب کوئی مقابلہ پیش آتا تھا تو وہ صرف دو فریقوں کے درمیان ہوتا تھا۔ مثلاً قدیم یثرب کی جنگ بعاث اوس اور خزرج کے درمیان تھی، مگر آج ہم منظم اسٹیٹ کے دور میں جی رہے ہیں۔ اب دو متحارب فریقوں کے علاوہ یہاں ایک تیسرا فریق بھی ہے، اور وہ پولیس ہے۔

مذکورہ انداز میں سوچنے والے لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ جب ہم مسلمانوں کا علیحدہ پاکٹ بنا دیں گے تو ہم اس پوزیشن میں ہو جائیں گے کہ "ہندو حملہ آوروں" کا اجتماعی قوت سے دفاع کر سکیں۔ مگر یہ محض خام خیالی ہے۔ کیوں کہ تیسرا فریق (پولیس) ایسے موقع پر غیر جانبدار نہیں رہ سکتا۔ وہ فوراً آجائے گا اور کرفیو کا قانون نافذ کر کے پورے علاقہ کو اپنے کنٹرول میں لے لے گا۔ اس کے بعد یہ تیسرا فریق وہ سب کچھ مزید اضافہ کے ساتھ کرے گا جس سے بچنے کے لئے مسلم دانشور مسلمانوں کو علیحدہ پاکٹ بنانے کا مشورہ دے رہے ہیں۔

اسلام کی رو سے وہ اس لئے غلط ہے کہ اسلام میں ہجرت صرف اس وقت ہے جب کہ ہجرت کے سوا کوئی اور چارۂ کار سرے سے ممکن ہی نہ رہا ہو۔ ہندستان میں ایسی صورت ہرگز پائی نہیں جاتی۔ ہندستان کے فرقہ وارانہ فساد کا بالکل یقینی حل یہ ہے کہ مسلمان اعراض کا اصول اختیار کریں، وہ اشتعال انگیزی کے مواقع پر مشتعل نہ ہوں۔ سیکڑوں کی تعداد میں ایسے تجربات موجود ہیں کہ جب بھی مسلمانوں نے اعراض کا طریقہ اختیار کیا تو فساد نہیں ہوا۔ ایسی حالت میں انتقال آبادی کی بات کرنا اصول اسلام کی خلاف ورزی ہے نہ کہ اصول اسلام کی تعمیل۔

امام بخاری نے حضرت عائشہ کی روایت نقل کی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو جب بھی دو میں سے ایک صورت کو اختیار کرنا ہوتا تو آپ ہمیشہ آسان صورت کو اختیار فرماتے تھے (ما خُیّر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم بین امرین الا اختار ایسرھما)

اس سنت رسول کی روشنی میں دیکھئے تو ہجرت کی مذکورہ تجویز سراسر سنت رسول کے خلاف ہے۔ کیوں کہ رسول اللہ کا طریقہ انتخاب ایسر کا ہے۔ اور یہ نادان لوگ مسلمانوں کو انتخاب اعسر کا مشورہ دے رہے ہیں۔ اس معاملہ میں اعراض بلاشبہ آسان ہے اور ہجرت اس کے مقابلہ میں بلاشبہ مشکل۔

جیسا کہ اوپر عرض کیا گیا، فرقہ وارانہ فساد سے بچنے کے لئے ہمارے سامنے دو راستے ہیں۔ ایک اعراض کا اور دوسرے ہجرت کا۔ عقل اور تجربہ دونوں بتاتے ہیں کہ فرقہ وارانہ فساد کے مسئلہ کو اعراض کے ذریعہ بخوبی طور پر حل کیا جا سکتا ہے۔ پھر جو مسئلہ اعراض کے ذریعہ حل کیا جا سکتا ہو اس کے لئے ہجرت کی تجویز پیش کرنا کس قدر لغو اور کتنا زیادہ غیر اسلامی ہے۔

موجودہ مسلمانوں کو بلاشبہ ایک ہجرت کرنا ہے۔ مگر یہ مکانی ہجرت نہیں ہے بلکہ تدبیری ہجرت ہے۔ ۱۹۴۷ کے بعد سے اب تک مسلمان، کچھ نااہل لیڈروں کے مشورہ کے تحت جس اصول پر عمل کر رہے تھے وہ تھا ــــ احتجاج، دفاع، مظاہرہ، ٹکراؤ۔ اب انھیں چاہئے کہ اس طریقہ کو وہ مکمل طور پر چھوڑ دیں۔ اس کے بجائے وہ محبت، اخلاق، تحمل، اعراض اور حکمت کا طریقہ اختیار کریں۔ یہ ان کے لئے تدبیری ہجرت یا طریق کار میں ہجرت کے ہم معنی ہے۔ اور اسی میں ان کی یقینی کامیابی کا راز چھپا ہوا ہے۔

اسلام میں تیمم کی اجازت ہے۔ مگر تیمم کی اجازت اس وقت ہے جب کہ وضو کے لئے پانی موجود نہ ہو۔ اسی طرح اسلام کا ایک اصول ہجرت بھی ہے۔ مگر یہ اصول اسی وقت کے لئے ہے جب کہ دوسری کوئی ممکن صورت سرے سے موجود نہ رہے۔ ہندستان میں ہرگز کوئی ایسی ایمرجنسی کی صورت پائی نہیں جاتی۔ یہاں فرقہ وارانہ فساد کا جو مسئلہ ہے اس کو صبر و اعراض کے ذریعہ یقینی طور پر حل کیا جا سکتا ہے۔ اس لئے ہندستان میں آیت ہجرت مطلوب نہیں ہے۔ یہاں جو آیت مطلوب اور قابل انطباق ہے وہ قرآن کی یہ آیت ہے: وان تصبروا وتتقوا لا یضرکم کیدھم شیأ (آل عمران ۱۲۰)

تحمل کی ضرورت

مسلمانوں کے درمیان باہمی جھگڑے اتنے زیادہ بڑھ گئے ہیں کہ آپ کسی بھی دن اور کسی بھی مقام پر اس کا نمونہ دیکھ سکتے ہیں۔ اس سلسلہ میں ایک خبر پڑھئے:

نئی دہلی، ۲۲ جون ۱۹۹۳ ـــــ حوض قاضی کے علاقہ کی گلی شاہ تارا میں ایک ہی گھر میں رہنے والے رشتہ داروں میں جھگڑا ہوگیا۔ نوبت یہاں تک پہنچ گئی کہ رشتہ داروں نے چاقو چلائے جس کے نتیجہ میں اشفاق نامی نوجوان کا قتل ہوگیا جب کہ اس کا بھائی شدید زخمی حالت میں جے پرکاش نرائن اسپتال میں داخل ہے۔

پولیس اطلاع کے مطابق گزشتہ شب گلی شاہ تارا میں ایک ہی خاندان کے دو کنبوں کے درمیان پرانے تنازعے نے انتہائی بھیانک رخ اختیار کرلیا۔ اخلاق (۲۸) اور اشفاق (۲۵) سگے بھائی ہیں جن کے کنبے پہلی منزل پر رہتے ہیں۔ دوسری منزل پر ان کے چچا محمد یاسین کا کنبہ رہتا ہے۔ کل یاسین کے گھر سے سیڑھیوں پر گندہ پانی پھینکا گیا جس پر اخلاق کے گھر والوں نے اعتراض کیا۔ اعتراض پر غلطی تسلیم کرنے کے بجائے مبینہ طور پر مزید کوڑا اور پانی پھینکا گیا جس پر بات بڑھ گئی۔ محمد یاسین نے اخلاق کو دبوچ لیا اور فاضل اور اس کے بھائی عامل نے مبینہ طور پر چاقو سے اس پر حملہ کردیا۔ اخلاق کو شدید زخمی حالت میں جے پرکاش نرائن اسپتال پہنچایا گیا جہاں وہ زیر علاج ہے۔ زاہد، ذاکر، صابر اور محمد یاسین اور عاشق بھی جھگڑے میں شامل تھے۔ مارپیٹ کے دوران زاہد اور عاشق نے اشفاق کو پکڑ لیا اور صابر اور ذاکر نے اس پر حملہ کیا۔ اس بار بھی چاقو کا استعمال کیا گیا جس سے اشفاق شدید طور پر زخمی ہو کر لہولہان ہوگیا۔ اسے بھی جے پرکاش نرائن اسپتال لے جایا گیا جہاں اسے مردہ قرار دے دیا گیا۔ حوض قاضی پولیس نے بلوہ کرنے، اقدام قتل، قتل اور اسلحہ ایکٹ کے تحت کیس درج کرلئے ہیں۔ مقامی پولیس نے محمد عامل کو گرفتار کرلیا ہے جب کہ بقیہ ملزموں کی بڑے پیمانے پر تلاش کی جارہی ہے۔

(قومی آواز ۲۳ جون ۱۹۹۳)

یہ ہندستان کے مسلمانوں کی حالت کی ایک مثال تھی۔ اب اس معاملہ میں پاکستان کے مسلمانوں

کی ایک مثال لیجئے۔ وہاں کی ایک مطبوعہ خبر یہ ہے:

لاہور، ۲۶ اپریل ۱۹۹۳ ـــــ اسلام پورہ کے علاقہ میں چار مسلح افراد نے شادی کے موقع پر پکنے والی دیگوں کا دھواں اپنے گھر آنے کی پاداش میں اندھا دھند فائرنگ کرکے اپنے ہمسایہ میں مقیم دولہا کے ۵۵ سالہ والد نذیر احمد کو موت کے گھاٹ اتار دیا جس سے شادی کی تقریب میں شریک ہنستا بستا گھرانہ ماتم کدہ بن گیا اور جہاں خوشیوں کے شادیانے بج رہے تھے، وہاں صف ماتم بچھ گئی۔ معلوم ہوا ہے کہ نذیر احمد کے بیٹے گلزار احمد کی شادی کے موقع پر اسلام پورہ میں ان کے گھر کے باہر دیگیں پکائی جارہی تھیں جن کا دھواں ساتھ والے گھر میں جارہا تھا جہاں رہائش پذیر عارف ڈوگر باہر آیا اور نذیر احمد سے کہا کہ یہ سلسلہ بند کرو کیوں کہ میرے اہل خانہ پریشان ہورہے ہیں۔ اس بات پر دونوں میں تلخ کلامی ہوگئی۔ تاہم محلہ داروں نے بیچ بچاؤ کروادیا۔ عارف ڈوگر چلا گیا لیکن دل میں رنجش رکھی۔ کچھ ہی دیر بعد وہ اپنے ساتھیوں، جاوید اقبال اور ظفر اقبال ڈوگر وغیرہ کے ساتھ مسلح ہوکر آیا اور گھر کے باہر کھڑے نذیر احمد پر فائرنگ کردی جس سے وہ شدید زخمی ہوگیا۔ اسے میو اسپتال لایا گیا جہاں وہ دم توڑ گیا۔ اسلام پورہ پولیس نے مقدمہ درج کرلیا ہے۔ (نوائے وقت، لاہور، ۲۷ اپریل ۱۹۹۳)

ایک معمولی بات پر اتنا بڑا جھگڑا کیسے پیدا ہوتا ہے کہ خون اور قتل اور پولیس اور عدالت تک معاملہ پہنچ جاتا ہے۔ اس کی وجہ صرف ایک ہے، اور وہ تحمل اور برداشت کی کمی ہے۔ ایک مقام پر جب دو خاندان یا دو گروہ رہتے ہوں تو ضرور مسائل پیدا ہوں گے۔ کبھی نہ کبھی ضرور ایک کو دوسرے سے تکلیف پہنچ جائے گی۔ یہ ایک سماجی مسئلہ ہے۔ مگر اس مسئلہ کا حل مسئلہ سے ٹکرانا نہیں ہے بلکہ مسئلہ کو برداشت کرنا ہے۔

یہاں آدمی کے لئے جو چوائس ہے وہ بے مسئلہ زندگی اور بامسئلہ زندگی کے درمیان نہیں ہے۔ بلکہ بامسئلہ زندگی اور بربادی کے درمیان ہے۔ آدمی کی عقلمندی یہ ہے کہ وہ چھوٹے مسئلہ کو برداشت کرلے تاکہ وہ بڑے مسئلہ میں پھنسنے سے بچ جائے۔

ایک صحابی کا قول اس معاملہ میں ساری باتوں کا خلاصہ ہے۔ انھوں نے اپنے بیٹے کو چند نصیحتیں کیں۔ ان میں سے ایک نصیحت یہ تھی کہ تم چھوٹی برائی کو برداشت کرو تاکہ تم بڑی برائی

سے اپنے آپ کو بچا سکو۔ انھوں نے کہا:

من لا یرضی بالقلیل مما یاتی بہ السفیہ یرضی بالکثیر

جو شخص نادان کے چھوٹے شر پر راضی نہیں ہوگا اس کو نادان کے بڑے شر پر راضی ہونا پڑے گا۔

یہ دنیا امتحان کی دنیا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے یہاں ہر انسان کو آزادی عطا کی ہے۔ ہم کسی سے اس کی آزادی کو چھین نہیں سکتے۔ اس لئے یہاں پرامن زندگی کے حصول کی عملی تدبیر صرف یہ ہے کہ ناخوشگوار معاملات میں نظر انداز کرنے کی پالیسی اختیار کی جائے۔ اس دنیا میں آپ اگر پانی کو برداشت نہ کریں تو خون کو برداشت کرنا ہوگا۔ اگر آپ دھوئیں کو برداشت نہ کریں تو آگ کو برداشت کرنا ہوگا۔ اگر آپ کڑوے بول کو برداشت نہ کریں تو جان و مال کی ہلاکت کو برداشت کرنا ہوگا۔

یہی دنیا ہے اور یہ دنیا خود خدا کی تخلیقی اسکیم کے تحت بنی ہے۔ جو آدمی دنیا کے اس نقشہ پر راضی نہ ہو اس کو ایک اور کائنات تخلیق کرنی چاہئے۔ کیوں کہ خدا کی بنائی ہوئی کائنات میں تو اس کے سوا کوئی اور چیز ممکن نہیں۔

زندگی نام ہے برداشت کا۔ برداشت سے کام لینے والا اس دنیا میں زندہ رہتا ہے اور ترقی کرتا ہے۔ اور جو لوگ آپس کے تعلقات میں بے برداشت ہو جائیں، ان کے لئے اس دنیا میں نہ ترقی ہے اور نہ زندگی۔

موجودہ زمانہ میں مسلمانوں کا اصل مسئلہ یہ ہے کہ انھوں نے اپنے نااہل رہنماؤں کی غلط رہنمائی کے نتیجہ میں برداشت کی صفت کھو دی ہے۔ وہ ہر معاملہ کو بس جہاد اور ٹکراؤ کا مسئلہ سمجھتے ہیں۔ کوئی بھی اشتعال انگیز بات ان کو بھڑکا دینے کے لئے کافی ہے۔ حالاں کہ اشتعال انگیزی پر مشتعل نہ ہونے ہی کا نام انسانیت ہے اور یہی دین کی تمام تعلیمات کا خلاصہ ہے۔

اس ملک میں ہندوؤں اور مسلمانوں کے ساتھ جو جھگڑے ہوتے ہیں، اس سے بہت زیادہ تعداد ان جھگڑوں کی ہے جو مسلمانوں اور مسلمانوں کے درمیان ہو رہے ہیں۔ مسلم۔ مسلم جھگڑے اخباروں میں بہت کم چھپتے ہیں۔ جب کہ ہندو اور مسلم کے درمیان جھگڑا ہو تو وہ تمام اخبارات کے صفحہ اول پر چھپ جاتا ہے۔ اس کی وجہ بالکل سادہ ہے۔ مسلمان اور مسلمان کا جھگڑا دو آدمی یا

دو خاندان تک محدود ہو کر رہ جاتا ہے، اس لئے وہ بڑی خبر نہیں بنتا۔ جب کہ ہندو اور مسلمان کا جھگڑا فوراً دو فرقوں کا جھگڑا بن جاتا ہے۔ اس طرح وہ بڑی خبر کی حیثیت اختیار کر لیتا ہے۔

۱۹۴۷ سے پہلے جن مسلم لیڈروں نے تقسیم ملک کی تحریک چلائی ان کی غلطی یہ تھی کہ انھوں نے برداشت کے مسئلہ کو بٹوارہ کا مسئلہ سمجھا۔ کسی ہندو اور کسی مسلمان میں کبھی کسی بات پر نزاع ہو گئی۔ تو وہ فوراً دو قومی نظریہ کا جھنڈا لے کر کھڑے ہو گئے۔ ان مسلم لیڈروں نے کہا کہ یہ جھگڑے اور دنگے اس لئے ہوتے ہیں کہ ہندو اور مسلمان دو قوم ہیں، وہ ایک ساتھ نہیں رہ سکتے۔ مگر جب ملک بٹ کر علیحدہ پاکستان بن گیا تو وہاں بھی جھگڑے اور فساد بدستور پوری شدت کے ساتھ موجود تھے۔ اس فرق کے ساتھ کہ پہلے یہ جھگڑے ہندو اور مسلمان کے درمیان ہوتے تھے، اب وہ مسلمان اور مسلمان کے درمیان ہونے لگے۔

اس کی وجہ یہ ہے کہ جب کچھ لوگ مل جل کر رہیں تو ان کے درمیان بار بار کچھ ناخوشگوار باتیں پیش آجاتی ہیں۔ ان باتوں کا حل علیحدگی نہیں ہے بلکہ برداشت اور نظر انداز کرنا ہے۔ اگر انھیں برداشت نہ کیا جائے تو تقسیم کے بعد جب مسلمان اپنا علیحدہ ملک یا علیحدہ پاکٹ بنالیں گے تو اصل حالت میں اس کے سوا کوئی اور فرق نہ ہوگا کہ پہلے جو نکراؤ دو فرقوں کے افراد کے درمیان ہو رہا تھا وہ اب خود ایک فرقہ کے افراد کے درمیان ہونے لگے گا۔ آج یہی سب کچھ پاکستان میں بہت بڑے پیمانے پر ہو رہا ہے۔

۱۹۴۷ سے پہلے علیحدگی پسند لیڈروں نے مسلمانوں کو جو ذہن دیا تھا، بدقسمتی سے وہی ذہن آج بھی مسلمانوں کے درمیان موجود ہے۔ مسلمانوں کے نام نہاد رہنما اسی سابقہ ذہن کے تحت مسلمانوں کو فکری رہنمائی دینے میں مشغول ہیں۔ تقسیم کا ناکام تجربہ بھی ان کی آنکھ کھولنے کے لئے کافی نہیں ہوا۔

۱۹۴۷ سے پہلے تقسیم پسند لیڈروں نے جغرافی علیحدگی کو ہندو مسلم مسئلہ کا حل بتایا تھا۔ آج کے متقلد لیڈر بھی کسی نہ کسی طور پر اسی علیحدگی کے طریقہ کو اس ملک میں مسلمانوں کے مسئلہ کا حل بتا رہے ہیں۔ کوئی کہہ رہا ہے کہ مسلمان اپنا کلچرل تشخص الگ قائم کریں۔ کوئی کہہ رہا ہے کہ مسلمان اپنی آبادیاں الگ کر کے اپنا علیحدہ پاکٹ بنائیں۔ کوئی کہہ رہا ہے کہ مسلمان دفاع کے اصول پر

چل کر ہندوؤں کو سبق سکھائیں۔ کوئی کہہ رہا ہے کہ مسلمان اپنی علیحدہ سیاسی جماعت بنا کر اپنا تحفظ کریں۔ وغیرہ۔

اس قسم کی تمام باتیں سراسر نادانی کی باتیں ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ مسلمانوں کے مسئلہ کا حل ۱۹۴۷ سے پہلے بھی یہی تھا کہ وہ مل جل کر رہنا سیکھیں۔ اور آج بھی یہی ہے کہ وہ دوسروں کے ساتھ مل جل کر اپنی زندگی کی تعمیر کریں۔ حتی کہ مسلمان اپنا الگ ملک بنوالیں تو وہاں بھی مسئلہ کا حل مل جل کر رہنا ہی ہوگا۔ اور اگر وہ اس ملک میں جگہ جگہ اپنی آبادیاں علیحدہ کرلیں تو اس علیحدہ آبادی میں بھی یہی اصول اختیار کرنا ہوگا۔ ورنہ وہ ایک برباد انسانی گروہ بن کر رہ جائیں گے۔ اور کبھی ترقی نہ کرسکیں گے۔

اس سلسلہ میں ایک نہایت عجیب حقیقت یہ ہے کہ برصغیر ہند کے مسلمان جو اپنے وطن میں آپس میں بھی لڑتے ہیں اور اپنے غیر مسلم پڑوسیوں سے بھی لڑتے ہیں، یہی مسلمان جب عرب ملکوں میں یا یورپ اور امریکہ میں جاتے ہیں تو وہاں وہ خوب صلح و آشتی کے ساتھ رہتے ہیں۔ حتی کہ ہمارے علماء بھی جو اپنے ملک میں ایک نہ ایک اشوے کو جلسہ جلوس کے ہنگامے برپا کرتے ہیں ہیں۔ یہی لوگ عرب ملکوں میں جاتے ہیں تو وہاں اختلافی معاملات میں وہ بالکل خاموش رہتے ہیں۔ حالاں کہ عرب ملکوں میں وہ تمام مسائل پوری طرح موجود ہیں جو برصغیر ہند میں پائے جاتے ہیں۔

مسلمانوں کے عوام و خواص اگر اس دوعملی کو ختم کردیں۔ وہ صرف اتنا کریں کہ عرب ملکوں میں اور یورپ اور امریکہ میں وہ جس طرح صلح و آشتی کے ساتھ رہتے ہیں، اسی طرح وہ اپنے ملک میں بھی رہنے لگیں تو اچانک ان کا اپنا ملک بھی ان کے لئے اتنا ہی اچھا ہو جائے گا جتنا کہ دنیا کا کوئی دوسرا ملک انھیں اچھا نظر آتا ہے۔

اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ زندگی میں اصل اہمیت خارجی سہولت کی نہیں ہے بلکہ ذاتی شوق کی ہے۔ آدمی کے اندر ذاتی شوق ہو تو وہ مشکلوں میں بھی اپنا راستہ بنالے گا۔ اور اگر ذاتی شوق نہ ہو تو سہولتوں کی فراوانی بھی ایسے آدمی کے لئے بے فائدہ ثابت ہوگی۔

لندن سے حال ہی میں ایک کتاب چھپی ہے۔ اس میں تفصیل کے ساتھ تقسیم ہند کے واقعات کا ذکر ہے۔ اس کے مصنف مسٹر اینڈریو رابرٹس ہیں:

Andrew Roberts, Eminent Churchillians

اس کتاب میں ہندستان کے آخری برٹش وائسرائے لارڈ ماؤنٹ بیٹن پر سخت تنقید کی گئی ہے۔ مثال کے طور پر مصنف نے لکھا ہے کہ آزادی کی تاریخ ابتداءً یکم جولائی ۱۹۴۸ مقرر کی گئی تھی۔ مگر ماؤنٹ بیٹن نے اچانک تاریخ بدل کر ۱۴ اگست ۱۹۴۷ کر دی۔ اس جلد بازی کا نتیجہ پنجاب کے علاقہ کا خونی فساد (اگست۔ اکتوبر ۴۷) تھا۔ کیوں کہ اس وقت پنجاب میں بہت کم فورس تھی۔ کتاب میں سر جارج کنگھم کا قول نقل کیا گیا ہے:

The Punjab disturbances were the direct result of Mountbatten's unwisdom in accelerating the date of partition so suddenly.

اس وقت پنجاب میں ۲۳ ہزار پولیس فورس موجود تھی جس کو اٹھارہ ہزار بستیوں میں چودہ ملین انسانوں کو کنٹرول کرنا تھا۔ ظاہر ہے کہ یہ ناکافی تھا اور وقت کی کمی کے باعث مزید فورس منگائی نہ جا سکی۔ مگر یہ ناگزیر تھا۔ کیونکہ جنگ کے نتیجہ میں برطانیہ کے پاس فورس باقی نہیں رہی تھی۔

لندن سے نکلنے والے ماہنامہ صراط مستقیم (نمبر ۲ - ۱۹۹۴) میں ایک سرخی تھی: برطانوی مسلمان طلبہ کی مشکلات۔ اس کے تحت درج تھا کہ ہفت روزہ "کیونیوز" کی ایک رپورٹ کے مطابق سلاؤ شہر میں اسکول کے ایک ۱۴ سالہ طالب علم فیض شریف کو مخلوط رقص کی کلاس میں شرکت سے انکار پر دو ماہ کے لئے کلاس سے خارج کر دیا گیا۔ اسکول کی ہیڈ مسٹرس نے فیض شریف کو اسکول سے خارج کرتے ہوئے کہا کہ یہ مسلمان مقامی کلچر سے ہم آہنگ ہونا نہیں چاہتے۔ صراط مستقیم نے لکھا تھا کہ اس خبر کا یہ روشن پہلو ہے کہ مغربی معاشرہ میں رہتے ہوئے بھی ایسے خاندان ہیں جو اپنے بچوں کو اسلامی بنیادوں پر تربیت دے رہے ہیں۔ مگر دوسرا پہلو یہ ہے کہ ایسے مسلمان بچوں

کا تعلیمی مستقبل اس ملک میں تاریک دکھائی دے رہا ہے۔

اس سے بھی زیادہ بڑا اندیشہ یہ ہے کہ ایسے بچے جب بڑے ہوں گے اور دیکھیں گے کہ ناقص تعلیم کی بنا پر وہ زندگی کی دوڑ میں پیچھے ہو گئے تو وہ نہ صرف اپنے سرپرستوں کو بلکہ شاید اسلام کو بھی اپنے پچھڑے پن کا ذمہ دار ٹھہرا کر کسی منفی رجحان میں مبتلا ہو جائیں۔

لندن سے ایک عربی مجلہ البیان شائع ہوتا ہے۔ اس کے شمارہ ربیع الاول ۱۴۱۵ (اگست۔ ستمبر ۱۹۹۴) میں دکتور نفیس احمد کے قلم سے ایک مضمون ہندستانی مسلمانوں کے بارہ میں تھا۔ اس کی جذباتی سرخی حسب ذیل الفاظ میں قائم کی گئی تھی: وا اسلاماہ، ردّة بين مسلمي الهند، فماذا نحن فاعلون؟

اس طرح کے مضامین اور بیانات ہر روز مسلمانوں کے عربی، انگریزی اور اردو اخبارات و رسائل میں چھپتے رہتے ہیں جن میں ہندوؤں کے مقابلہ میں مسلمانوں کی مظلومیت کا ذکر ہوتا ہے۔ مگر آج تک کسی بھی مسلم اخبار یا رسالے میں ایسا کوئی مضمون میری نظر سے نہیں گزرا جس میں ہندوؤں کی اس شدید تر مظلومیت کا ذکر ہو کہ وہ شرک اور الحاد اور غیر اللہ کی پرستش میں مبتلا ہیں اور اس کے نتیجہ میں وہ خدا کی پکڑ کی زد میں آنے والے ہیں۔ مسلمانوں کی موجودہ حالت اگر قومی ہمدردی کا جذبہ پیدا کرتی ہے تو ہندوؤں کی موجودہ حالت سے ہمارے اندر دعوتی خیر خواہی کا شدید جذبہ ابھرنا چاہئے۔ مگر میرے علم میں ایسے افراد اتنے کم ہیں کہ اگر ان پر الشاذ کالمعدوم کا حکم عائد کیا جائے تو یقیناً ایسا کرنا بے جا نہ ہوگا۔

برطانیہ میں مقیم ایک مسلمان سے گفتگو ہو رہی تھی۔ انھوں نے شکایت کے انداز میں کہا کہ آجکل برطانیہ کی مساجد کی تعمیر کے لئے پلاننگ کی اجازت (planning permission) حاصل کرنا سخت مشکل ہو گیا ہے۔ ان کی گفتگو کا تاثر بظاہر یہ تھا کہ برطانیہ میں مسلمانوں کے ساتھ تعصب برتا جا رہا ہے۔ مگر جب میں نے تحقیق کی تو معلوم ہوا کہ یہ تمام تر انتظام کا معاملہ ہے نہ کہ تعصب کا معاملہ۔

پندرہ سال پہلے یہ حال تھا کہ مسجد کی تعمیر کی اجازت یا اس کا نقشہ نہایت آسانی سے منظور ہو جاتا تھا۔ اس سلسلہ میں جو مشکلات پیدا ہوئی ہیں وہ حال کی پیداوار ہیں نہ یہ کہ وہ پہلے سے موجود رہیں۔ اصل یہ ہے کہ برطانیہ کی مسجدوں میں نہایت لغو قسم کی سیاست داخل ہو گئی ہے۔

مثلاً حال ہی میں لیوٹن کی ایک مسجد میں دو مسلم گروپ آپس میں الجھ گئے اور زبردست مار پیٹ کی نوبت آگئی۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ پولیس والے جوتوں سمیت مسجد میں داخل ہو گئے۔ اس طرح کے واقعات متعدد مسجدوں میں پیش آئے۔ اور ان سب کے پیچھے عہدے اور گدی کی سطحی سیاست کے سوا اور کچھ نہیں۔

انگریزوں کا احساس یہ ہے کہ مسجدیں برٹش کلچر کی روایات کو بگاڑ رہی ہیں۔ جب کہ یہی شکایت ان کو ہندوؤں اور دوسرے مذاہب کی عبادت گاہوں کے بارہ میں نہیں۔ وہ مسجدوں کو انتظامیہ کے لئے "پرابلم" کی نظر سے دیکھنے لگے ہیں۔ ایسی حالت میں اگر وہ نئی مسجد کی تعمیر سے متوحش ہوں تو اس میں تعجب کی کوئی بات نہیں۔

برطانیہ ایک انتہائی روایت پسند قوم ہے۔ اس کا ایک اندازہ برطانی مکانات سے ہوتا ہے۔ یہاں کے مکانات عام طور پر اسی مخصوص طرز کے ہوتے ہیں جو سیکڑوں سال سے ان کے یہاں چلا آرہا ہے۔ ذیل کی تصویر سے اس کا اندازہ ہوگا۔

لندن کا فیسٹول ۷ اگست تک چلنے والا تھا۔ ہندستانی ہائی کمشنر ڈاکٹر سنگھوی نے کہا کہ ۶ اگست کو وہ اپنی رہائش گاہ پر ڈنر کر رہے ہیں۔ ان کا اصرار تھا کہ میں اس میں شرکت کروں۔ مسٹر نٹور سنگھ

کا خصوصی پیغام ملا کہ اس ڈنر کے موقع پر میرا موجود رہنا ضروری ہے۔ مگر اسی کے ساتھ مانچسٹر میں کچھ عرب نوجوان اکٹھا ہوئے تھے۔ ان نوجوانوں کا اصرار تھا کہ میں ان کے ساتھ مانچسٹر میں کچھ وقت گزاروں۔ چنانچہ فیسٹول کے منتظمین اور ڈاکٹر سنگھوی سے معذرت کرتے ہوئے ۵ اگست کی سہ پہر کو میں لندن سے مانچسٹر کے لئے روانہ ہوا۔

یہ سفر دو عرب نوجوانوں کے ساتھ انٹرسٹی (Intercity) کے ذریعہ طے ہوا۔ ڈھائی گھنٹہ میں ہم لوگ مانچسٹر پہنچ گئے۔ راستے میں مختلف قسم کے مناظر نگاہ کے سامنے سے گزرے۔ ان کو دیکھ کر ایک خیال میرے ذہن میں آیا۔ اس کو میں نے عرب نوجوانوں سے حسب ذیل الفاظ میں بیان کیا:

من ھو المؤمن۔ المؤمن ھو الذی یری الجنۃ فی کل جمال ویری جھنم فی کل قبح (مومن کون ہے۔ مومن وہ ہے جو ہر حسن میں جنت کا مشاہدہ کرے اور ہر قبح میں جہنم کو دیکھ لے)

مانچسٹر میں میرا قیام ایک عرب نوجوان کی رہائش گاہ پر تھا۔ وہ یہاں تعلیم کی غرض سے مقیم ہیں۔ یہیں پر مختلف عرب نوجوانوں سے ملاقات ہوئی۔ انھیں میں سے ایک طارق الکردی تھے۔ وہ آئرلینڈ (ڈبلن) میں رہتے ہیں۔ انھوں نے بتایا کہ آئرلینڈ اور انگلینڈ میں دعوت کے زبردست مواقع ہیں۔ مگر یہاں کے مسلمانوں کو دعوت کے کام سے کوئی دلچسپی نہیں۔ یہ بات انھوں نے اپنے تجربہ کی بنیاد پر کہی اور اس سلسلہ میں کئی واقعات بھی بیان کئے۔ انھوں نے ڈبلن میں ایک چھوٹا سا دعوتی سنٹر بھی قائم کیا ہے۔

مانچسٹر سے ایک عربی ماہنامہ صوت الغربا شائع ہوتا ہے۔ اس کا شمارہ جمادی الثانیہ ۱۴۱۲ھ (دسمبر ۱۹۹۲) دیکھا۔ اس کے نام کے نیچے یہ حدیث درج تھی: بدأ الاسلام غریبا و سیعود غریبا کما بدأ۔ فطوبی للغرباء۔ اس میں واشنگٹن میں مقیم دکتور جعفر شیخ ادریس کا انٹرویو پڑھا۔ یہ المسلمون (۳۰ اکتوبر ۱۹۹۲) سے لیا گیا تھا۔ انٹرویور نے پوچھا کہ یہ کہا جاتا ہے کہ اشتراکی خطرہ کے زوال کے بعد مغرب کو ایک نئے دشمن کی ضرورت ہے۔ اس لئے اب وہ اسلام کو اپنے دشمن کے طور پر پروجکٹ کر رہا ہے۔ دکتور ادریس نے کہا کہ یہ خیال درست نہیں (ان ھذا لیس صحیحاً) انھوں نے کہا کہ یہ بات میں اس لئے کہہ رہا ہوں کہ میں امریکہ میں رہتا ہوں۔ میں روزانہ دو یا تین امریکی اخبار پڑھتا ہوں۔ مگر میں ان میں اسلام یا مسلمانوں کے خلاف کوئی چیز نہیں پاتا (انی اقرأ

صحیفتین او ثلاث صحف یومیا فلا اجد فیہا طعنا فی الاسلام او المسلمین)

انھوں نے کہا کہ مغرب کی سیاست کسی مذہب کے ساتھ دشمنی پر قائم نہیں ہے بلکہ خود اپنی مصلحت (interest) پر قائم ہے (ان سیاسۃ الغرب لا تقوم علی التعصب بل تقوم علی المصلحۃ) انھوں نے کہا کہ اہل مغرب اپنے مزاج کے تحت کھلے دل سے اسلام کا مطالعہ کرنے کے لئے تیار ہیں مگر ان کے عقل معیار کے مطابق اسلامی لٹریچر ہمارے یہاں موجود ہی نہیں۔ انھوں نے کہا کہ مغربی تہذیب کے متعلق ہم جو کچھ لکھتے ہیں وہ بالکل سطحی ہوتا ہے جس پر یہ لوگ ہنستے ہیں۔ ہم گہرائی کے ساتھ نہ ان کے بارہ میں لکھتے ہیں اور نہ اپنے بارہ میں۔ جب کہ ان میں بہت سے ارباب فہم ہیں جو کھلے ذہن کے ہیں۔ وہ ہم سے سننا چاہتے ہیں اور ہمارے بارہ میں پڑھنا چاہتے ہیں۔ حتی کہ خود اپنے خلاف تنقید کو بھی۔ یہ حقیقت ہے کہ ہماری کتابیں کسی بھی درجہ میں ان کے لئے چیلنج نہیں ہیں (ان ما کتبہ عن ہذہ الحضارۃ شیٔ سطحی یثیر ضحک ہؤلاء الناس وربما سخر یتم فنحن لا نکتب بعمق عنہم او عن انفسنا ابداً۔ مع ان کثیراً من مفکریہم ذوی عقل متفتح یریدون ان یسمعوا منا ویقرأوا لنا حتی فی باب النقد لہم ان کتاباتنا لیصراحۃ لا تمثل تحدیا فکریا للغرب علی ای مستوی (صفحہ ۱۲)

۶ اگست کا دن مانچسٹر میں عرب نوجوانوں کے ساتھ گزرا۔ اگلے دن صبح کو فجر کی نماز کے بعد میں اپنے کمرہ میں دیر تک کچھ پڑھتا لکھتا رہا۔ جب بخوبی دن نکل آیا تو میں اس کمرہ میں گیا جس میں چند عرب نوجوان سو رہے تھے۔ میں نے کہا کہ آپ لوگ ابھی تک سو رہے ہیں۔ صبح کو سویرے نہ اٹھنا ہر روز اپنا کئی گھنٹہ ضائع کرنا ہے۔ اور وقت ایسی چیز ہے جس کو عربی مثل میں تلوار سے تشبیہ دی گئی ہے۔ چنانچہ کہا گیا ہے کہ وقت تلوار کی مانند ہے۔ اگر تم اس کو نہ کاٹو تو وہ تم کو کاٹ ڈالے گا (الوقت کالسیف ان لم تقطعہ قطعک)

اگست ۱۹۹۴ کی ۶ تاریخ ہے اور ساڑھے بارہ بجے کا وقت۔ بادلوں کے درمیان ہلکی دھوپ نکلی ہوئی ہے۔ موسم نہایت خوشگوار ہے۔ میں دو عرب نوجوانوں کے ساتھ مانچسٹر کے الگزینڈرا پارک میں بیٹھا ہوا ہوں۔ میں نے کہا کہ انگریزوں نے دنیا میں وسیع ترین سلطنت قائم کی حتی کہ شاید مسلم سلطنت سے بھی زیادہ بڑی۔ مگر اس وسیع سلطنت میں کبھی کسی انگریز نے ردولٹ نہیں کیا، جبکہ

مسلمانوں کی پوری تاریخ رد ولٹ سے بھری ہوئی ہے۔ خلیفۂ اول کے زمانہ میں یمنی قبائل نے مرکز سے رد ولٹ کیا جس کو ردّۃ کہا جاتا ہے۔ اس کے بعد ساری تاریخ میں مسلسل ایسا ہوتا رہا ہے کہ جس شخص کو جہاں موقع ملا اس نے مرکز سے بغاوت کر دی اور اپنی چھوٹی سی حکومت الگ بنا کر بیٹھ گیا۔ موجودہ زمانہ میں پاکستان میں یہی ہوا جب کہ بنگلہ دیش (مشرقی پاکستان) نے مرکز سے بغاوت کر کے اپنی علیحدہ حکومت قائم کر لی۔

انھوں نے پوچھا کہ اس فرق کا سبب کیا ہے۔ میں اس سبب کو بیان کر رہا تھا اور عرب نوجوان ٹیپ ریکارڈر ہاتھ میں لئے ہوئے اس کو ریکارڈ کر رہے تھے۔ اتنے میں ایک شخص گزرا جو بظاہر افریقی تھا، اس نے پوچھا کہ کیا یہ کوئی اخباری انٹرویو ہے۔

کچھ دیر کے بعد دو سفید فام نوجوان آئے۔ وہ ۱۴-۱۵ سال کی عمر کے ہوں گے۔ وہ کسی قدر جھومنے کے انداز میں چل رہے تھے۔ ان کے جسم پر معمولی لباس تھا۔ ان میں سے ایک شخص نے کہا کہ میں آپ کو دھوکا نہیں دے رہا ہوں۔ ہم لوگ بھوکے ہیں۔ کیا آپ ہمیں کچھ پیسہ دے سکتے ہیں:

I am not cheating, but we are a bit hungary. Can you give us some change?

ایک عرب نوجوان نے سوال کیا کہ ابھی یہاں آتے ہوئے میں اپنی گاڑی میں قرآن کی تلاوت سن رہا تھا۔ میرے ذہن میں یہ خیال آیا کہ قرآن کے مطابق، انسان کو جب اختیار دیا جاتا ہے تو وہ فساد برپا کرتا ہے۔ پھر جو لوگ جنت میں جائیں گے کیا ان سے اختیار سلب کر لیا جائے گا تاکہ وہ وہاں فساد نہ کر سکیں۔ میں نے کہا کہ آپ جانتے ہیں کہ کون لوگ جنت میں جائیں گے۔ جنت میں وہ لوگ جائیں گے جنھوں نے اس دنیا میں یہ ثابت کیا کہ وہ فساد کرنے والے لوگ نہیں ہیں۔ خواہ انھیں مکمل آزادی دیدی جائے۔ پھر جن لوگوں نے اس وقت فساد نہیں کیا جب کہ خدا حالت غیب میں تھا، وہ اس وقت کیسے فساد کریں گے جب کہ خدا حالت شہود میں آجائے گا:

من هم الذين سيدخلون الجنة في الآخرة. الذين أثبتوا في هذه الدنيا أنهم سوف لن يستعملوا حريتهم للإفساد ولو كانت عندهم حرية كاملة فالذين هم لم يفسدوا بالغيب كيف سيفسدون في الشهادة۔

ایک اور عرب نوجوان نے سوال کیا کہ قرآن کی آیت اذا تمنی القی الشیطان فی امنیتہ (الحج ۵۲) کے حوالہ سے ایک مستشرق نے لکھا ہے کہ رسول کے کلام میں کبھی کبھی شیطان اپنی بات ملا دیتا تھا۔ مفسرین نے بھی ایسا ہی لکھا ہے۔ پھر اس کا کیا مطلب ہے۔ کیا رسول بھی شیطان کی مداخلت سے محفوظ نہ تھے۔ میں نے کہا کہ — امنیۃ کا لفظ یہاں تلاوت کے معنی میں ہے۔ یعنی پیغمبر نے جب تلاوت کی تو شیطان نے اس کی تلاوت میں ملا دیا۔ یہاں جو بات کہی گئی ہے وہ تلاوت کے بارہ میں ہے۔ مگر لوگوں نے اس کو وحی (نص کلام) سے متعلق کر دیا۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی زبان سے تو وہی بات نکلی تھی جو آپ پر وحی کی گئی ہے۔ مگر جب آپ اس کی تلاوت کرتے اور وہ لوگوں کے درمیان شائع ہو جاتی تو کچھ فتنہ پسند لوگ آپ کے کلام کی غلط تاویل کر کے اس کے بارہ میں الٹی باتیں مشہور کرنے کی کوشش کرتے۔ گویا کہ یہ الہامی ملاوٹ نہیں تھی بلکہ تفسیری ملاوٹ تھی۔

عرب نوجوانوں کی ایک مجلس میں میں نے کہا کہ ایک نومسلم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آیا۔ اس نے کہا کہ اے خدا کے رسول، مجھ سے بہت سے گناہ ہو گئے ہیں۔ کیا میری مغفرت ہو جائے گی۔ آپ نے فرمایا کہ کیا تم کو نہیں معلوم کہ اسلام پچھلے اعمال کو ختم کر دیتا ہے (الاسلام یھدم ما قبلہ) ایک طرف آپ نے یہ خبر دی ہے۔ دوسری طرف حدیث میں ہے کہ لا الہ الا اللہ کہہ کر اپنے ایمان کو نیا کرتے رہو (جددوا ایمانکم بقول لا الہ الا اللہ)

اس میں ہمارے لئے ایک تسلی ہے۔ جب ایمان سے پچھلے گناہ معاف ہو جاتے ہیں اور ایمان کی تجدید کا موقع بھی ساری عمر تک ہے، تو ہم کو چاہئے کہ ہم بار بار کلمۂ شہادت ادا کریں اور اللہ تعالیٰ سے کہیں کہ خدایا، تیرے رسول کی خبر کے مطابق، میں اپنے ایمان کی تجدید کر کے پھر سے اسلام میں داخل ہوتا ہوں، تو میرے پچھلے تمام گناہوں کو میرے نامۂ اعمال سے حذف کر دے۔

۱۹۹۳ میں نیویارک سے قرآن کا ایک نیا انگریزی ترجمہ چھپا ہے۔ اس کے مترجم ٹامس کلیری (Thomas Cleary) ہیں۔ اس کا ایک نسخہ میں نے مانچسٹر میں دیکھا۔ یہ نہایت معیاری انداز میں چھپا ہے اور بہت خوبصورت ہے۔ اس کے انٹروڈکشن میں مترجم لکھتے ہیں کہ قرآن بلا تردید عظیم اہمیت کی کتاب ہے۔ حتی کہ غیر مسلموں کے لئے بھی، شاید آج اس کی اہمیت ہمیشہ سے زیادہ ہے:

The Qur'an is undeniably a book of great importance even to the non-Muslim, perhaps more today than ever.

ان الفاظ میں مترجم نے اس بات کا اعتراف کیا ہے کہ موجودہ زمانہ میں مذاہب کے مطالعہ کا رجحان بہت بڑھ گیا ہے، اس بنا پر اسلام کا مطالعہ بھی آج زیادہ سے زیادہ لوگ کرنا چاہتے ہیں۔ یہ بھی غالباً اس تاریخی عمل کا ایک جزء ہے جس کو حدیث میں ادخال کلمہ کہا گیا ہے۔

تاہم کسی غیر مسلم کا ترجمہ خواہ مترجم کتنا ہی سنجیدہ ہو، وہ غلطیوں سے خالی نہیں ہو سکتا۔ مثلاً اس ترجمہ میں فالذین ھاجروا (آل عمران ۱۹۵) کا ترجمہ اس طرح کیا گیا ہے:

and as for those who have fled. (p. 28)

الجزائر کی سالویشن پارٹی (جبھۃ الانقاذ) سے تعلق رکھنے والے ایک نوجوان سے مانچسٹر میں ملاقات ہوئی۔ یہ لوگ عام طور پر اپنی پارٹی کو فس (FIS) کہتے ہیں۔ میں نے کہا کہ آپ لوگ اپنی حکومت کے خلاف لڑائی چھیڑے ہوئے ہیں۔ حالاں کہ مسلمانوں کے لئے اپنے حکمراں کے خلاف خروج کو حرام قرار دیا گیا ہے۔ انھوں نے کہا کہ ہم انتخابات میں جیت رہے تھے۔ مگر ان حکمرانوں نے انتخابات کو منسوخ کر کے زبردستی ملک میں اپنی حکومت قائم کر لی۔ میں نے کہا کہ یہ تو لڑائی کے لئے وجہ جواز نہیں۔ کیوں کہ حدیث میں ہے کہ تم اپنے حکمراں کی اطاعت کرو، خواہ وہ تمہاری پیٹھ پر کوڑا مارے اور خواہ وہ تمہارا مال چھین لے (وإن جلد ظهرك وأخذ مالك) پھر انتخابات کی منسوخی تو اس سے بہت چھوٹی زیادتی ہے۔ کیوں کہ انتخابات کی منسوخی کا مطلب یہ ہے کہ انھوں نے آپ کو سیاسی اقتدار تک پہنچنے کا راستہ روک دیا۔ مگر آپ کی پیٹھ اور آپ کا مال تو پھر بھی محفوظ تھا۔

انھوں نے کہا کہ آپ کو نہیں معلوم کہ وہ الجزائر میں کس طرح ہم کو مار رہے ہیں۔ میں نے کہا کہ آپ کو انصاف سے کام لینا چاہئے۔ کیوں کہ قرآن میں ہے کہ ولا یجرمنکم شنآن قوم علی أن لا تعدلوا اعدلوا۔ آپ کے حکمرانوں نے آپ کو مارنے کا سلسلہ اس وقت شروع کیا جب کہ آپ نے ان کے خلاف سیاسی لڑائی چھیڑ دی۔ اگر شریعت کے مطابق آپ ان سے ٹکراؤ چھوڑ دیں تو وہ بھی آپ کو سیاست کے سوا دوسرے تمام میدانوں میں عمل کے لئے آزاد چھوڑ دیں گے، جیسا کہ موجودہ

سیاسی ٹکراؤ سے پہلے وہ آپ کو آزاد چھوڑے ہوئے تھے۔

۷ اگست کو میں مانچسٹر میں تھا کہ ۱۰ بجے ایک عرب نوجوان (عادل الریانی) ملاقات کے لئے آئے۔ وہ پرسٹن میں اپنی انگلش بیوی کے ساتھ رہتے ہیں۔ وہ کچھ دیر تک مجھ سے لپٹ کر روتے رہے۔ انھوں نے بتایا کہ یکم اگست ۱۹۹۴ کو وہ پرسٹن کی مسجد قوت الاسلام میں گئے۔ اس وقت وہ مقفل تھی۔ اس کے منتظم سے انھوں نے کہا تو اس نے مسجد کا تالا کھول دیا۔ عادل الریانی نماز پڑھ کر بیٹھے ہوئے تھے کہ ایک شخص نے ان کی پیٹھ پر ہاتھ رکھا۔ انھوں نے دیکھا تو ایک سفید فام نوجوان (تقریباً ۳۰ سال) کھڑا ہوا تھا۔ اس نے کہا کہ معاف کیجئے، میں مسلمان ہونا چاہتا ہوں:

Excuse me, I want to become a Muslim.

عادل الریانی نے فوراً مسجد سے نکل کر ایک اور مسلمان کو بلایا اور پھر کلمہ پڑھا کر اس کو اسلام میں داخل کیا۔ اس کے بعد وہ بہت زیادہ خوش ہو گیا۔ اس کا اسلامی نام عمران ہے:

Imran Maynard, 42 Healthfield Drive,
Brookfield, Preston. (Tel. 0772-651991)

مسلمان صدیوں سے اسلامی دعوت کو چھوڑے ہوئے تھے۔ یہاں تک کہ اللہ تعالیٰ کو اپنے بندوں پر رحم آیا۔ اس نے لوگوں کے دلوں میں اسلام کی طلب پیدا کر دی۔ اب وہ خود اسلام قبول کر رہے ہیں۔

ایک تعلیم یافتہ عرب جو کافی عرصہ سے انگلینڈ میں رہتے ہیں، انھوں نے کہا کہ انگریز لوگ اپنے مزاج کے اعتبار سے امن پسند ہیں۔ ان کا مخمور آدمی بھی حد کے اندر رہتا ہے۔ حتی کہ ان کے کتے بھی مؤدب ہوتے ہیں۔ وہ لڑائی کو پسند نہیں کرتے، وہ کسی بھی جارحیت والی چیز کو پسند نہیں کرتے (هم لا يحبون الحرب هم لا يحبون اى شئ عدوانى)

میں نے خود اپنے تجربہ میں بھی کئی ایسی چیزیں دیکھیں جس سے محسوس ہوا کہ کم از کم فکری اعتبار سے یہاں کا پسندیدہ کلچر امن کلچر ہے۔ ایسے لوگوں کے سامنے دین کو اس انداز میں پیش کرنا کہ وہ لوگوں سے لڑ کر ساری دنیا میں اپنی حکومت قائم کرنا چاہتا ہے، سراسر غیر حکیمانہ ہے۔ ایسا مذہب ان لوگوں کے لئے قابل قبول نہیں ہو سکتا۔ اس سے قطع نظر کہ اسلام کی یہ سیاسی تعبیر صحیح ہے یا غلط، یہ اس حدیث

کے خلاف ہے جس میں آپ نے فرمایا لوگوں کو خوش خبری دو، ان کو متنفر کرنے والی بات نہ کرو۔ کیا تم چاہتے ہو کہ اللہ اور اس کے رسول کو جھٹلایا جائے۔

اخوانی فکر کے ایک عرب نوجوان سے بات کرتے ہوئے میں نے کہا کہ ابن تیمیہ کا قول ہے کہ اللہ ظالم حکومت کو قیام عطا نہیں کرتا خواہ وہ مسلم ہو، اللہ عادل حکومت کو قیام عطا کرتا ہے خواہ وہ کافر ہو (ان اللہ لا یقیم الدولۃ الظالمۃ ولو کانت مؤمنۃ ویقیم الدولۃ العادلۃ ولو کانت کافرۃ)۔ میں نے کہا کہ اس قول کی روشنی میں آپ لوگوں کے سیاسی احتجاجات بالکل بے معنی ہیں۔ آپ ہر جگہ یہ شکایت کر رہے ہیں کہ فلاں لوگوں نے آپ کو سیاسی اقتدار سے محروم کر دیا۔ مگر قرآن کے مطابق اقتدار خدا کی طرف سے دیا جاتا ہے۔ جب اس نے آپ کو اقتدار نہیں دیا تو اس کو اپنی کوتاہی پر محمول کرتے ہوئے آپ کو اپنی اصلاح میں لگ جانا چاہئے نہ کہ غیر ضروری طور پر آپ دوسروں کے خلاف احتجاج کرنے لگیں۔

ایک عرب نوجوان نے عبداللہ فہد النفیسی کی ایک عربی کتاب دی۔ اس کا نام تھا: عند ما یحکم الاسلام (صفحات ۱۶۲)۔ میں نے کہا کہ اس کتاب کا نام صحیح نہیں۔ وہ تعجب میں پڑ گئے۔ ان کی سمجھ میں نہ آیا کہ کتاب کا نام کیسے غیر صحیح ہو سکتا ہے۔ میں نے کہا کہ اسلام حکومت نہیں کرتا بلکہ انسان حکومت کرتا ہے۔ اسلامی نظام کی موجودگی میں بھی حکمراں حیثیت انسان کی ہوتی ہے۔ بنو امیہ کے دور میں اسلامی قانون جاری تھا۔ لیکن نظام جب یزید کے ہاتھ میں تھا تو آپ جانتے ہیں کہ وہاں کیا ہوا۔ مگر نظام جب عمر بن عبد العزیز کے ہاتھ میں آگیا تو وہی نظام کچھ اور نظام بن گیا۔ اس لئے اصل مسئلہ اسلام کو حاکم بنانے کا نہیں ہے۔ بلکہ اصل مسئلہ یہ ہے کہ حاکم کو اسلامی بنایا جائے۔ حاکم کو اسلامی بنانے کے بعد ہی کوئی اسلامی نتیجہ برآمد ہو سکتا ہے۔

پاکستان سے ایک پندرہ روزہ المنبر نکلتا ہے۔ ایک پاکستانی بزرگ کے یہاں اس کا شمارہ ۱۱ جون ۱۹۹۴ دیکھا۔ اس میں مولانا علی میاں کی ایک تقریر تھی جو انھوں نے اسلام آباد میں کی تھی۔ اس میں انھوں نے کہا: دو تین سال کا واقعہ ہے کہ میں بیروت گیا۔ میرے ایک دوست مجھے اپنی گاڑی پر بیروت کی سیر کرا رہے تھے۔ انھوں نے گاڑی چلاتے ہوئے کہا کہ مولانا، ممالک اسلامیہ میں آج جو ذہنی، فکری اور سیاسی بے چینی اور کشمکش پائی جاتی ہے یہ غیر اسلامی ممالک میں کیوں نہیں

پائی جاتی۔ یہ اسلامی ممالک کے ساتھ ہی کیوں مخصوص ہے (صفحہ ۸) مولانا علی میاں اس سوال کا کوئی واضح جواب نہ دے سکے۔

عجیب بات ہے کہ یہی سوال اس سے پہلے میں نے ایک مغربی پروفیسر سے کیا تھا۔ اس نے ایک لمحہ کے لئے سوچا۔ اس کے بعد بولا ـــــ اس فرق کا سبب شاید یہ ہے کہ ہم اختلاف کا استقبال کرتے ہیں جب کہ مسلم معاشرہ میں اختلاف کو امر ممنوع سمجھا جاتا ہے:

Perhaps the reason is that here we welcome dissent. Whereas in Muslim societies dissent is always seen as a taboo.

میں سمجھتا ہوں کہ یہ جواب نہایت درست ہے۔ مغربی دنیا میں اختلاف اور تنقید کو صحت مندی کی علامت سمجھا جاتا ہے۔ جب کہ مسلم دنیا کا حال یہ ہے کہ ہر شخصیت، ہر ادارہ، ہر جماعت، ہر سیاسی نظام تقریباً بلا استثناء، تنقید و اختلاف کو ایک ناقابل برداشت برائی کا درجہ دئے ہوئے ہے۔ اب چوں کہ طبیعتوں کے تنوع کی بنا پر اختلاف رائے بالکل ناگزیر ہے، مغربی دنیا میں اختلاف پر کھلی آزادی ہونے کی وجہ سے لوگوں کے جذبات کو نکاس ملتا رہتا ہے۔ اس کے برعکس مسلم دنیا میں اختلاف پر روک کی وجہ سے مسلسل ذہنی خلفشار موجود رہتا ہے جس کا اظہار مختلف صورتوں میں ہوتا رہتا ہے۔

پاکستان کے مشہور اردو روزنامہ نوائے وقت (۲۴ اگست ۱۹۹۴) میں ایک "تحریک پاکستان گولڈ میڈلسٹ" کے قلم سے مضمون چھپا تھا۔ اس کا عنوان تھا: وحدت ملی کے لئے ناسور فرقہ واریت۔ اس مضمون میں انھوں نے کہا تھا کہ ۱۹۴۷ سے پہلے تحریک پاکستان کے زمانہ میں جواہر لال نہرو نے کہا تھا کہ: "اصل مسئلہ اقتصادی ہے، مذہبی نہیں ہے اور اس میں ہندو مسلم کی تفریق نہیں ہے۔ مگر مسلمان قوم نے اس بیان کو پرکاہ کے برابر وقعت نہ دی اور پوری طرح قائداعظم کا ساتھ دیا۔"

مگر پاکستان بننے کے بعد ملینوں لوگ پاکستان سے بھاگ بھاگ کر یورپ اور امریکہ پہنچ گئے کیا اس کا محرک مذہبی تھا۔ ظاہر ہے کہ نہیں۔ اس کا واحد سبب اقتصادی تھا۔ لوگ سمجھتے تھے کہ پاکستان کے مقابلہ میں برطانیہ اور امریکہ میں ان کے لئے زیادہ بہتر کمائی کے مواقع ہیں، وہاں وہ زیادہ بہتر

دہی زندگی بنا سکتے ہیں۔ اس لئے جس پاکستانی کو موقع ملا وہ پہلی فرصت میں پاکستان سے بھاگ کر وہاں پہنچ گیا۔ کتنا بڑا فریب تھا جس میں لوگ ۱۹۴۷ سے پہلے مبتلا ہوئے، اور کتنا بڑا فریب ہے جس میں وہ اب تک مبتلا ہیں۔

ایک تعلیم یافتہ عرب سے ملاقات ہوئی۔ وہ برطانیہ کے ایک اسلامک سنٹر کے مدیر (ڈائرکٹر) ہیں۔ گفتگو کے دوران انھوں نے کہا کہ اس زمانہ میں دشمنان اسلام کا مقابلہ کرنے کے لئے اور اسلامی دنیا میں ان کی سازشوں اور ان کے فتنوں کے توڑ کے لئے دعوت سب سے زیادہ اہم ہے، خواہ مسلم ملکوں کا معاملہ ہو یا دوسرے ملکوں کا (الدعوۃ فی عصرنا ھذا ھی من اوجب الواجبات لمواجھۃ اعداء الاسلام ودفع مؤامراتھم ومکائدھم وشرورھم عن دیار الاسلام سواء داخل دیار المسلمین او خارجھا)

میں نے کہا کہ آخری نتیجہ کے اعتبار سے یہ دعوت کا ایک پہلو ہو سکتا ہے۔ مگر داعی کے اپنے ذہن کے اعتبار سے یہ کوئی درست بات نہیں۔ دعوت دراصل محبت اور خیر خواہی کا عمل ہے۔ اگر آپ دوسری قوموں کو دشمن اسلام کے خانہ میں ڈال دیں تو آپ کبھی خیر خواہی کے جذبہ کے ساتھ ان کے اوپر دعوت کا کام نہیں کر سکتے۔ دعوت کے لئے ماں کا جذبہ درکار ہے، اور ماں کبھی اپنے بیٹے کو دشمن کے روپ میں نہیں دیکھتی، خواہ بظاہر وہ سرکشی کا فعل کیوں نہ کر رہا ہو۔

مانچسٹر کالج، آکسفورڈ سے ایک جرنل نکلتا ہے۔ اس کا نام ہے فیتھ اینڈ فریڈم۔ اس کے نمبر ۱۳۴ (۱۹۹۲) میں جارج کریسیڈیز (George Chryssides) کا ایک مضمون دیکھا۔ اس کا عنوان تھا مذہبی آزادی (Religious Freedom)۔ اس مضمون میں روزنامہ گارجین (The Guardian) کے شمارہ ۲۷ جولائی ۱۹۹۱ کے حوالہ سے ایک واقعہ نقل کیا گیا تھا۔ انھوں نے لکھا تھا:

کچھ لوگوں کا خیال ہو سکتا ہے کہ انگلینڈ جیسے بظاہر آزاد سماج میں سب کچھ ٹھیک ہے اور وہاں مذہبی آزادی محفوظ ہے۔ مگر افسوس کہ ایسا نہیں ہے۔ بہت سی مثالوں میں سے اس کی ایک مثال یہ ہے کہ کچھ مہینہ پہلے ایک انجینئرنگ فرم کے مینیجنگ ڈائرکٹر نے راتھرہم (Rotherham) میں ایک اسٹاف کے لئے اشتہار دیا۔ اس اشتہار میں یہ شرط درج تھی کہ مسلمان اس کے لئے درخواست نہ بھیجیں:

no Muslims need apply.

ڈائرکٹر کا خیال تھا کہ مسلمان جارح اور جنگ پسند ہوتے ہیں۔ اس کے ذہن میں مسلمان کی تصویر اس غضب ناک بھیڑ کو دیکھ کر بنی تھی جو حال کے مظاہروں میں سلمان رشدی کی کتاب دی سیٹنک ورسز کے نسخے سڑکوں پر جلا رہا تھا (صفحہ ۴۹)

۷ اگست کو مانچسٹر سے بذریعہ ٹرین روانگی ہوئی۔ ڈیڑھ گھنٹہ کا سفر طے کرنے کے بعد برمنگھم پہنچا۔ ایک عرب نوجوان میرے ساتھ تھے۔ ان سے پورے راستہ میں باتیں ہوتی رہیں۔ وہ سوال کرتے اور میں جواب دیتا۔ اس کو وہ ساتھ ہی ساتھ ٹیپ پر ریکارڈ کرتے رہے۔

برمنگھم ریلوے اسٹیشن پر جناب شمشاد خاں صاحب موجود تھے۔ ان کے ساتھ روانہ ہو کر ان کی رہائش گاہ پہنچا جہاں مجھ کو ٹھہرنا تھا۔ شمشاد خاں صاحب کو قرآن کے مطالعہ کا بہت ذوق ہے۔ آج شام کا وقت زیادہ تر قرآن کے بارہ میں مذاکرہ میں گزرا۔ انھوں نے بتایا کہ عبد اللہ یوسف علی کا جو ترجمہ ملینوں کی تعداد میں چھپ کر ساری دنیا میں پھیلا ہے، اس کے تفسیری نوٹ میں غالباً اختصار کے خیال سے کئی چیزیں نکال دی گئی ہیں۔ مگر اختصار کی اس کوشش میں بہت سی نہایت اہم چیزیں بھی حذف ہو گئیں۔ مثلاً سورہ فاتحہ کی کمنٹری میں انھوں نے ایک بڑی قیمتی چیز لکھی تھی جو مروجہ نسخوں میں موجود نہیں۔ انھوں نے لکھا تھا کہ کیوں ایسا ہے کہ سورہ فاتحہ میں جو الفاظ ہیں وہ اس طرح ہیں جس طرح ہم اپنی زبان سے ان کو ادا کریں۔ یعنی وہ بندہ کی زبان میں ہیں۔ اس سلسلہ میں انھوں نے لکھا تھا کہ جب ہم معرفت کے درجہ کو پہنچتے ہیں تو یہ الفاظ بے ساختہ طور پر ہمارے اندر سے نکلنے لگتے ہیں:

When we reach enlightenment, they flow spontaneously from us. (p. 14)

کمنٹری کا یہ جزء ایمانی کیفیت سے بھرا ہوا ہے لیکن مروجہ نسخہ میں اس کو نکال دیا گیا ہے۔

عبد اللہ یوسف علی صاحب نے اپنے ترجمہ قرآن کا جو دیباچہ (Preface) ۱۹۳۴ کے اڈیشن میں شامل کیا تھا، اس کے آغاز میں انھوں نے لکھا تھا کہ قرآن کی تبلیغ ایک ایسا کام ہے جس میں ہر مرد و عورت بلکہ بچے بھی اپنی استعداد (capacity) کے مطابق حصہ لے سکتے ہیں۔ یہ بات بے حد اہم ہے۔ اس کی ایک عملی مثال مجھے برمنگھم کے اس سفر میں معلوم ہوئی۔

شمشاد خاں صاحب کی چھوٹی صاحبزادی امینہ یہاں ایک اسکول میں پڑھتی ہیں۔ ایک روز ان

کی عیسائی ٹیچر نے بائبل کے مطابق بتایا کہ خدا نے چھ دن میں دنیا بنائی اور ساتویں دن آرام کیا۔ امینہ نے ہاتھ اٹھایا۔ خاتون ٹیچر نے کہا کہ تم کو کچھ کہنا ہے۔ انھوں نے کہا کہ ہاں۔ ٹیچر نے کہا کہ کہو: امینہ نے کہا کہ آپ کہتی ہیں کہ خدا نے آرام کیا۔ مگر میرے والدین نے تو مجھ کو بتایا ہے کہ خدا کو آرام کرنے کی ضرورت پیش نہیں آتی:

My parents say that God Almighty does not need any rest.

ٹیچر لڑکی کی اس بات سے متاثر ہوئی۔ اس نے کہا کہ اچھا تم اسلامی لٹریچر لاکر ہمیں دو، ہم اس کو پڑھیں گے۔ اس کے بعد امینہ نے انھیں اسلامی کتابیں پہنچانا شروع کر دیا۔ امینہ کے بھائی اسد میاں نے دیکھا کہ بہن اسلام کی تبلیغ کر رہی ہے تو انھوں نے بھی اپنی کلاس میں اسی طرح کی گفتگو کا سلسلہ شروع کر دیا۔

۸ اگست کی صبح کو چار بجے نیند کھل گئی۔ فجر کی نماز یہاں ۵ بجے تھی۔ شمشاد خاں صاحب اور ان کے صاحبزادہ اسد میاں کے ساتھ سنٹرل مسجد گیا اور وہاں فجر کی نماز ادا کی۔ مسجد کافی بڑی ہے۔ پہلی صف میں آدمی صف کے بقدر نمازی موجود تھے۔ راستہ میں شمشاد خاں صاحب نے کئی قصے بتائے۔

احمد دیدات صاحب اکثر انگلینڈ آتے رہتے ہیں۔ ان کے اندر حاضر جوابی کی صفت بہت زیادہ ہے۔ انھوں نے بتایا کہ امریکہ میں ایک بار ایک عیسائی مبلغ سے ان کا ڈیبیٹ تھا۔ عیسائی نے کہا کہ آپ ایک افریقی ہیں۔ مگر آپ امریکہ کے جس شہر میں چاہیں جا سکتے ہیں۔ اسی طرح ہم مکہ کیوں نہیں جا سکتے۔ احمد دیدات صاحب نے کہا کہ آپ جانتے ہیں کہ ہر ملک میں داخل ہونے کے لئے کچھ شرطیں ہوتی ہیں۔ آپ ایک مقرر فارم پر کرتے ہیں۔ پھر آپ کو ویزا دیا جاتا ہے۔ اس کے بعد ہی آپ اس ملک میں داخل ہوتے ہیں، اسی طرح مکہ میں داخل ہونے کی بھی ایک سادہ سی شرط ہے۔ آپ کہئے کہ لا الٰہ الا اللہ محمد رسول اللہ اور پھر آپ جب چاہیں مکہ کے اندر داخل ہو سکتے ہیں۔

پھر عیسائی نے کہا کہ آپ امریکہ میں آئے ہیں یہاں ہم اور آپ ایک جگہ بیٹھ کر ڈیبیٹ کر رہے ہیں۔ اسی طرح مکہ میں دو مذہبوں کے درمیان ڈیبیٹ کیوں نہیں ہو سکتا۔ احمد دیدات صاحب نے کہا کہ یہ بھی بہت آسان بات ہے۔ آج ہم سٹلائٹ کے دور میں جی رہے ہیں۔ آج ڈیبیٹر کو سفر کر کے کہیں جانے کی ضرورت نہیں۔ آج سٹلائٹ کے ذریعہ ہر جگہ اس قسم کے مشترک

ڈیبیٹ کا انتظام کیا جا سکتا ہے۔ ایک سعودی شیخ نے احمد دیدات صاحب کے اس پروگرام کو ویڈیو پر دیکھا۔ اس جواب پر وہ اتنا خوش ہوا کہ اس نے انھیں دو ملین ڈالر دے دیے۔

مغربی دنیا میں سب سے بڑا فتنہ ٹی وی ہے۔ تقریباً سبھی لوگ اس کی شکایت کرتے ہیں۔ مگر تقریباً سبھی لوگ عملاً اس کو اختیار کیے ہوئے ہیں۔ اس کا اثر بچوں پر بہت برا پڑ رہا ہے۔ یہاں ایک تعلیم یافتہ مسلمان نے اس مسئلہ کا نہایت عمدہ حل نکال لیا ہے۔ پہلے ان کے گھر میں ٹی وی دیکھا جاتا تھا۔ اب انھوں نے اینٹینا نکال کر اس کا استعمال اپنے گھر کے اندر بالکل بند کر دیا ہے۔ جہاں تک خبروں کا تعلق ہے، وہ ان کو ریڈیو پر سن لیتے ہیں۔ بقیہ پروگرام کے لئے انھوں نے ایک صاحب کے ذریعہ یہ انتظام کیا ہے کہ ہر ہفتہ وہ چیک کر کے دیکھ لیا کریں کہ اس ہفتہ میں کون کون اسلامی پروگرام آرہا ہے یا کون سا مفید پروگرام ہے۔ ایسے پروگرام کو وہ ویڈیو پر ریکارڈ کر کے انھیں دے دیتے ہیں تاکہ وہ ان کو وی سی آر پر دیکھ سکیں۔ اس طرح چوائس انھوں نے اپنے ہاتھ میں لے لیا ہے۔ اب وہ اور ان کے بچے ٹی وی پر آنے والے سارے پروگرام نہیں دیکھتے۔ وہ صرف وہی پروگرام دیکھتے ہیں جن کو وہ خود دیکھنا چاہتے ہیں۔

مذکورہ مسلمان کے صاحبزادہ مسٹر اسد علی سے میری گفتگو ہوئی۔ انھوں نے کہا کہ پہلے ہم کو کمی کا احساس ہوتا تھا۔ مگر اب ایسا احساس نہیں ہوتا۔ اب ہمارا تمام وقت تعلیم کی مصروفیات میں گزر جاتا ہے۔ سارا معاملہ یوز ٹو (Use to) ہونے کا ہے۔ آپ جس چیز کے عادی ہو جائیں وہی آپ کو ٹھیک معلوم ہونے لگے گا۔

برمنگھم کے اخبار ایوننگ میل (۲۰ جولائی ۱۹۹۴) میں ایک اشتہار تھا کہ دس ہزار پونڈ کی ایک کار جیتو (win a car) اس عنوان کے تحت جلی حرفوں میں لکھا ہوا تھا ــــ اپنے خواب کو پورا کرنے کا ایک موقع :

A chance to make dream come true.

یہ لاٹری کی قسم کا ایک معاملہ تھا۔ اس کو پڑھ کر خیال آیا کہ اس سے بھی زیادہ بڑا موقع انسان کو یہ ملا ہے کہ وہ دنیا کی مختصر زندگی میں عمل صالح کا ثبوت دے اور آخرت کی ابدی کامیابی کا مستحق بنے۔ کار کا خواب بہت چھوٹا خواب ہے اور جنت کا خواب اس کے مقابلہ میں بہت بڑا خواب۔

قاہرہ کے اخبار ایجپشین گزٹ (The Egyptian Gazette) کے ایڈیٹر انچیف ایم علی ابراہیم (Tel. 2831040) نے ۱۸ مارچ ۱۹۹۶ کو صدر اسلامی مرکز کا ایک تفصیلی انٹرویو لیا۔ سوالات کا تعلق ہندستان اور عالم اسلام کے مسائل سے تھا۔ ایک سوال کے جواب میں کہا گیا کہ ہندستان میں ڈیموکریسی ہے اور مکمل آزادی حاصل ہے۔ چنانچہ یہاں مختلف اسلامی ادارے، بشمول اسلامی مرکز، آزادانہ طور پر اسلامی خدمات انجام دے رہے ہیں۔

۲ نئی دہلی کے ہندی اخبار جے وی جی ٹائمس کے نمائندہ مسٹر شاہد رضا نے ۱۹ مارچ ۱۹۹۶ کو صدر اسلامی مرکز کا انٹرویو لیا۔ سوالات کا تعلق زیادہ تر اس سے تھا کہ مسجد کے امام کے بارہ میں شرعی احکام کیا ہیں۔ اس سلسلہ میں ضروری تفصیلات بتائی گئیں۔

۳ ایجنسی فرانس پریس (A.F.P.) کے نمائندہ مسٹر ابھیک چندا نے ۲۳ مارچ ۱۹۹۶ کو صدر اسلامی مرکز کا انٹرویو لیا۔ سوالات کا تعلق زیادہ تر ہندستانی مسلمانوں کے سیاسی سماجی اور تعلیمی حالات سے تھا۔ ایک سوال کے جواب میں کہا گیا کہ کوئی سیاسی پارٹی مسلمانوں کے مسائل کو حل نہیں کر سکتی۔ اس کا واحد حل یہ ہے کہ مسلمان اپنی کمیوں کو دور کریں۔ یہ تفصیلی انٹرویو ٹیلیفون پر ریکارڈ کیا گیا۔

۴ پرکھ ٹی وی ٹیم نے ۲۵ مارچ ۱۹۹۶ کو صدر اسلامی مرکز کا انٹرویو ریکارڈ کیا۔ سوالات کا تعلق اسلام میں عورتوں کے مسائل سے تھا۔ ایک سوال کے جواب میں کہا گیا کہ موجودہ مسلم سماج میں عورتوں کو جو مسائل پیش آرہے ہیں، ان کا سبب اسلام کا قانون نہیں ہے اس کا سبب یہ ہے کہ موجودہ زمانہ کی مسلم عورتیں تعلیم میں پچھڑ گئی ہیں۔ موجودہ تمام مسائل اسی پچھڑے پن کے نتائج ہیں۔

۵ انگریزی روزنامہ پانیر کے نمائندہ مسٹر اعجاز اشرف نے ۲۸ مارچ ۱۹۹۶ کو ٹیلیفون پر صدر اسلامی مرکز کا انٹرویو لیا۔ سوالات کا تعلق زیادہ تر اپریل ۔ مئی ۱۹۹۶ کے الکشن سے تھا۔ ایک سوال کے جواب میں کہا گیا کہ اس الکشن میں کسی ایک پارٹی کو مطلق اکثریت

نہیں مل سکتی۔ اس لئے بہتر یہ ہے کہ ملیشیا کے انداز کی مخلوط حکومت یہاں بنائی جائے۔

۶ سری شکل دھام (دہلی ۸) کے تحت ۳۱ مارچ ۱۹۹۶ کو سرودھرم سمیلن ہوا۔ اس کی دعوت پر صدر اسلامی مرکز نے اس میں شرکت کی اور مذہب کی حقیقت پر ایک تقریر کی۔

۷ جین مہاسبھا کی طرف سے فکی آڈیٹوریم (نئی دہلی) میں ۳۱ مارچ ۱۹۹۶ کو ایک کانفرنس ہوئی۔ جس میں دلائی لاما بھی شریک تھے۔ اس کا موضوع تھا نان وائلنس اور ٹالرنس۔ صدر اسلامی مرکز نے اس کی دعوت پر اس میں شرکت کی اور موضوع پر اسلام کا نقطۂ نظر پیش کیا۔

۸ انگریزی روزنامہ انڈین اکسپرس کے نمائندہ مسٹر پارسا وینکٹیشور نے ۸ اپریل ۱۹۹۶ کو صدر اسلامی مرکز کا انٹرویو لیا۔ سوالات کا تعلق زیادہ تر اس سے تھا کہ آئندہ الکشن (نئی دہلی ۱۹۹۶) میں مسلمانوں کا ووٹنگ پیٹرن کیا ہوگا۔ جواب کا خلاصہ یہ تھا کہ مسلمانوں کے اندر پولیٹیکل شعور کی شدید کمی ہے، اس لئے بظاہر امید نہیں کہ وہ اپنے ووٹ کی طاقت کو زیادہ مفید طور پر استعمال کر سکیں گے۔

۹ دہلی کے انگریزی ماہنامہ ڈپلومیٹک ایرا (Diplomatic Era) کے اڈیٹر مسٹر جے پرکاش نے ۲۵ دسمبر ۱۹۹۵ کو صدر اسلامی مرکز کا انٹرویو لیا۔ انٹرویو کا تعلق زیادہ تر الرسالہ مشن سے تھا۔ ایک سوال کے جواب میں کہا گیا کہ نااہل لیڈروں کی غلط رہنمائی سے ایک عرصہ تک اس ملک کے ہندو مسلمانوں کو ایک قسم کی پرابلم کمیونٹی سمجھتے رہے۔ اسی طرح مسلمان ہندوؤں کو اپنے لئے پرابلم پڑوسی سمجھتے رہے۔ مگر اب دونوں اس وہم سے نکل آئے ہیں۔ اس فکری تبدیلی نے دونوں کے لئے ترقی کے نئے مواقع کھول دیئے ہیں۔

۱۰ ہندی اخبار جن ستا (دہلی) کے نمائندہ مسٹر کمار ندر نے ۱۳ اپریل ۱۹۹۶ کو صدر اسلامی مرکز کا انٹرویو لیا۔ سوالات کا تعلق زیادہ تر آئندہ الکشن (اپریل۔مئی ۱۹۹۶) سے تھا۔ ایک سوال کے جواب میں کہا گیا کہ مسلمانوں کو چاہیے کہ وہ منفی ووٹ دینے کا طریقہ ختم کریں اور مثبت فیصلہ کے تحت اپنی رائے دینے کا حق استعمال کریں۔

۱۱ صدر اسلامی مرکز نے ۱۱-۱۲ اپریل ۱۹۹۶ کو سردھنہ (میرٹھ) کا سفر کیا۔ اس کی روداد سفرنامہ کے تحت انشاء اللہ الرسالہ میں شائع کر دی جائے گی۔

۱۲ جین ٹی وی کی ٹیم (زیر قیادت مسٹر دھریندر ترپاٹھی) نے ۱۹ اپریل ۱۹۹۶ کو صدر اسلامی مرکز کا انٹرویو ریکارڈ کیا۔ سوالات کا تعلق زیادہ تر اس سے تھا کہ آنے والے الکشن میں مسلم ووٹر کا رجحان کیا ہوگا۔ ایک سوال کے جواب میں کہا گیا کہ اب مسلمان اپنے نام نہاد لیڈروں سے اتنا زیادہ بیزار ہو چکے ہیں کہ وہ ان کی کوئی بات سننے والے نہیں۔

۱۳ انگریزی اخبار ایشین ایج کی نمائندہ شیلا ریڈی نے ۲۰ اپریل ۱۹۹۶ کو صدر اسلامی مرکز کا انٹرویو لیا۔ ایک سوال کے جواب میں کہا گیا کہ اندازہ ہے کہ اس بار کے الکشن (اپریل۔ مئی ۱۹۹۶) میں مسلم ووٹر کسی کے کہنے سے کسی پارٹی کو ووٹ نہیں دے گا، وہ خود اپنی رائے کے تحت اس کا فیصلہ کرے گا۔

۱۴ نئی دہلی کے ہندی اخبار جے وی جی ٹائمس کے نمائندہ مسٹر شاہد رضا نے ۱۹ مارچ ۱۹۹۶ کو صدر اسلامی مرکز کا انٹرویو لیا۔ سوالات تعلق زیادہ تر اس سے تھا کہ مسجد کے امام کے بارہ میں شرعی احکام کیا ہیں۔ اس سلسلہ میں ضروری تفصیلات بتائی گئیں۔

۱۵ ہندی اخبار راشٹریہ سہارا کے نمائندے منسر پربھاگپتا اور ان کے ساتھی نے ۲۰ اپریل ۱۹۹۶ کو صدر اسلامی مرکز کا تفصیلی انٹرویو لیا۔ سوالات کا تعلق زیادہ تر ہندستانی مسلمانوں کے مسائل سے تھا۔ جوابات کا خلاصہ یہ تھا کہ ہندستان میں مسلمانوں کے لئے ہر قسم کی ترقی کے مواقع موجود ہیں۔ انھیں چاہئے کہ وہ مایوسی کی سوچ چھوڑ دیں اور مواقع کو استعمال کر کے بڑی بڑی ترقیاں حاصل کریں۔

۱۶ وشو اہما سماج کی طرف سے ۲۱ اپریل ۱۹۹۶ کو کانسٹی ٹیوشن کلب (نئی دہلی) میں ایک سیمنار ہوا۔ اس کا موضوع آفاقی انسان کی تیاری میں تعلیم کا رول تھا:

Role of education in creation of universal man

اس کی دعوت پر صدر اسلامی مرکز نے اس میں شرکت کی اور موضوع پر اپنے خیالات کا اظہار کیا۔ تقریر کا خلاصہ یہ تھا کہ تعلیم سے تنگ نظری ختم ہوتی ہے۔ اس طرح تعلیم آفاقی انسان بنانے میں مدد دیتی ہے۔

اُردو

	Rs.
تذکیر القرآن جلد اول	200/-
تذکیر القرآن جلد دوم	200/-
اللہ اکبر	45/-
پیغمبرِ انقلاب	50/-
مذہب اور جدید چیلنج	45/-
عظمتِ قرآن	35/-
عظمتِ اسلام	50/-
عظمتِ صحابہ	7/-
دینِ کامل	60/-
الاسلام	45/-
ظہورِ اسلام	50/-
اسلامی زندگی	30/-
احیاءِ اسلام	35/-
رازِ حیات	50/-
صراطِ مستقیم	40/-
خاتونِ اسلام	60/-
سوشلزم اور اسلام	40/-
اسلام اور عصرِ حاضر	30/-
الربانیہ	40/-
کاروانِ ملت	45/-
حقیقتِ حج	30/-
اسلامی تعلیمات	25/-
اسلام دورِ جدید کا خالق	25/-
حدیثِ رسولؐ	35/-
سفرنامہ (غیر ملکی اسفار)	85/-
سفرنامہ (ملکی اسفار)	–
میوات کا سفر	35/-
قیادت نامہ	30/-
راہِ عمل	25/-
تعبیر کی غلطی	70/-
دین کی سیاسی تعبیر	20/-
امہات المومنین	20/-
عظمتِ مومن	7/-
اسلام ایک عظیم جدوجہد	3/-
طلاق اسلام میں	3/-

تاریخ دعوتِ حق	5/-
مطالعۂ سیرت	12/-
ڈائری جلد اول	80/-
کتابِ زندگی	55/-
انوارِ حکمت	–
اقوالِ حکمت	25/-
تعمیر کی طرف	8/-
تبلیغی تحریک	20/-
تجدیدِ دین	25/-
عقلیاتِ اسلام	35/-
مذہب اور سائنس	–
قرآن کا مطلوب انسان	8/-
دین کیا ہے	5/-
اسلام دینِ فطرت	7/-
تعمیرِ ملت	7/-
تاریخ کا سبق	7/-
فسادات کا مسئلہ	5/-
انسان اپنے آپ کو پہچان	5/-
تعارفِ اسلام	5/-
اسلام پندرھویں صدی میں	5/-
راہیں بند نہیں	12/-
ایمانی طاقت	7/-
اتحادِ ملت	7/-
سبق آموز واقعات	7/-
زلزلۂ قیامت	10/-
حقیقت کی تلاش	7/-
پیغمبرِ اسلام	5/-
آخری سفر	7/-
اسلامی دعوت	7/-
خدا اور انسان	12/-
حل یہاں ہے	10/-
سچا راستہ	8/-
دینی تعلیم	7/-
حیاتِ طیبہ	7/-
باغِ جنت	7/-
فکرِ اسلامی	50/-

نارِ جہنم	7/-
خلیج ڈائری	10/-
رہنمائے حیات	7/-
مضامینِ اسلام	45/-
تعددِ ازدواج	10/-
ہندستانی مسلمان	40/-
روشن مستقبل	7/-
صومِ رمضان	7/-
علمِ کلام	9/-
اسلام کا تعارف	2/-
علماء اور دورِ جدید	8/-
سیرتِ رسولؐ	10/-
ہندستان آزادی کے بعد	1/-
مارکسزم تاریخ جس کو رد کر چکی ہے	7/-
سوشلزم ایک غیر اسلامی نظریہ	4/-
منزل کی طرف	2/-
الاسلام یتحدی (عربی)	85/-

ھندی

سچائی کی تلاش	8/-
انسان اپنے آپ کو پہچان	4/-
پیغمبرِ اسلامؐ	4/-
سچائی کی کھوج	10/-
آخری سفر	8/-
اسلام کا پریچے	8/-
پیغمبرِ اسلام کے مہان ساتھی	8/-
راستے بند نہیں	7/-
جنت کا باغ	8/-
بہو پتنی واد اور اسلام	10/-
اتہاس کا سبق	9/-
اسلام ایک سوابھاوک مذہب	8/-
اجول بھوشیہ	8/-
پوتر جیون	8/-
منزل کی اور	3/-

God Arises	Rs. 95/-
Muhammad: The Prophet of Revolution	85/-
Islam As It Is	55/-
God-Oriented Life	70/-
Religion and Science	45/-
Indian Muslims	65/-
The Way to Find God	20/-
The Teachings of Islam	25/-
The Good Life	20/-
The Garden of Paradise	25/-
The Fire of Hell	25/-
Man Know Thyself	8/-
Muhammad: The Ideal Character	5/-
Tabligh Movement	25/-
Polygamy and Islam	8/-
Words of the Prophet Muhammad	75/-
Islam: The Voice of Human Nature	30/-
Islam: Creator of the Modern Age	55/-
Woman Between Islam And Western Society	95/-
Woman In Islamic Shari'ah	65/-
Hijab in Islam	20/-
Concerning Divorce	7/-

آڈیو کیسٹ	Rs.
حقیقتِ ایمان	25/-
حقیقتِ نماز	25/-
حقیقتِ روزہ	25/-
حقیقتِ زکوٰۃ	25/-
حقیقتِ حج	25/-
سنتِ رسولؐ	25/-
میدانِ عمل	25/-
رسول اللہؐ کا طریقِ کار	25/-
اسلامی دعوت کے جدید امکانات	25/-
اسلامی اخلاق	25/-
اتحادِ ملت	25/-
تعمیرِ ملت	25/-
نصیحتِ لقمان	25/-

ایجنسی الرسالہ

ماہنامہ الرسالہ بیک وقت اردو، ہندی اور انگریزی زبانوں میں شائع ہوتا ہے۔ اردو الرسالہ کا مقصد مسلمانوں کی اصلاح اور ذہنی تعمیر ہے۔ ہندی اور انگریزی الرسالہ کا خاص مقصد یہ ہے کہ اسلام کی بے آمیز دعوت کو عام انسانوں تک پہونچایا جائے۔ الرسالہ کے تعمیری اور دعوتی مشن کا تقاضا ہے کہ آپ نہ صرف اس کو خود پڑھیں بلکہ اس کی ایجنسی لے کر اس کو زیادہ سے زیادہ تعداد میں دوسروں تک پہونچائیں۔ ایجنسی گویا الرسالہ کے متوقع قارئین تک اس کو مسلسل پہونچانے کا ایک بہترین درمیانی وسیلہ ہے۔

الرسالہ (اردو) کی ایجنسی لینا ملت کی ذہنی تعمیر میں حصہ لینا ہے جو آج ملت کی سب سے بڑی ضرورت ہے۔ اسی طرح الرسالہ (ہندی اور انگریزی) کی ایجنسی لینا اسلام کی عمومی دعوت کی مہم میں اپنے آپ کو شریک کرنا ہے جو کارِ نبوت ہے اور ملت کے اوپر سب سے بڑا فریضہ ہے۔

ایجنسی کی صورتیں

۱۔ الرسالہ (اردو، ہندی یا انگریزی) کی ایجنسی کم از کم پانچ پرچوں پر دی جاتی ہے۔ کمیشن ۲۵ فی صد ہے۔ ۱۰۰ پرچوں سے زیادہ تعداد پر کمیشن ۳۳ فی صد ہے۔ پیکنگ اور روانگی کے تمام اخراجات ادارہ الرسالہ کے ذمے ہوتے ہیں۔

۲۔ زیادہ تعداد والی ایجنسیوں کو ہر ماہ پرچے بذریعہ وی پی روانہ کیے جاتے ہیں۔

۳۔ کم تعداد کی ایجنسی کے لیے ادائیگی کی دو صورتیں ہیں۔ ایک یہ کہ پرچے ہر ماہ سادہ ڈاک سے بھیجے جائیں، اور صاحب ایجنسی ہر ماہ اس کی رقم بذریعہ منی آرڈر روانہ کردے۔ دوسری صورت یہ ہے کہ چند ماہ (مثلاً تین مہینے) تک پرچے سادہ ڈاک سے بھیجے جائیں اور اس کے بعد والے مہینہ میں تمام پرچوں کی مجموعی رقم کی وی پی روانہ کی جائے۔

زرِ تعاون الرسالہ

ہندستان کے لیے		بیرونی ممالک کے لیے (ہوائی ڈاک)	(بحری ڈاک)
ایک سال	Rs 70	ایک سال $20 / £10	$10 / £5
دو سال	Rs 135	دو سال $35 / £18	$18 / £8
تین سال	Rs 200	تین سال $50 / £25	$25 / £12
پانچ سال	Rs 300	پانچ سال $80 / £40	$40 / £18
خصوصی تعاون (سالانہ)	Rs 500	خصوصی تعاون (سالانہ) $100 / £50	

Finest collection of books on Islam

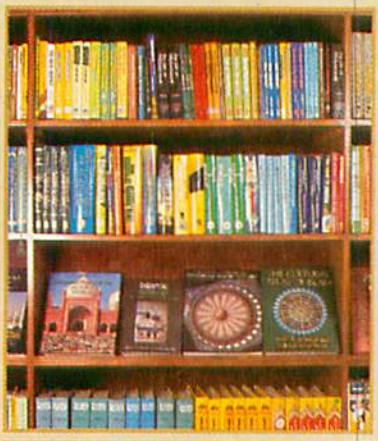

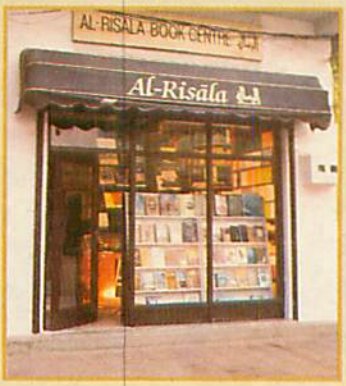

AL-RISALA BOOK CENTRE

1, Nizamuddin West Market, Near DESU, New Delhi-110 013

Tel. 4611128 Fax 4697333